قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ——— ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون: ۸۷۹۲۴۶

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون: ثریّا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدّین اکبر

ناشر: عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع: خالد منصور نسیم

مطبع: النّور پرنٹرز و پبلشرز

۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ، لاہور ۲۵

ٹیلیفون ——— ۴۸۵۸۲۶

مقامِ اشاعت: ۲۵/بی، گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

فہرست مضامین

جہاں مارکس ناکام رہ گیا	ادارہ	۲
ضیائے فکرِ قرآنی	ثریا عندلیب	۳۹
وہ ہمارا خواب تھا	لطیف چوہدری	۴۴
سیاسی پارٹیاں اور اسلام	حنیف وجدانی	۴۶
حقائق و عبر	ادارہ	۶۱
باب المراسلات	ادارہ	۶۴
اراکین کے نام	اشتیاق احمد کینیڈا	۶۹
بچّوں کے لئے	قاسم نوری	۷۱
الدّین	علامہ غلام احمد پرویزؒ	۷۵
درسِ قرآن	ادارہ	۷۶
قرآن کے انگریزی تراجم	رفیع اللہ شہاب	۸۰

جلد ۴۴ ——— اکتوبر ۱۹۹۱ء ——— شمارہ ۱۰

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان ——— ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ——— ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ: -/۱۰ روپے

جہاں مارکس ناکام رہ گیا

(اُس سے آگے)

روس میں اشتراکی نظام کی بنیاد ایک طرف ہیگل کا وہ فلسفہ ہے، جسے مارکس نے آگے بڑھایا اور دوسری طرف وہ معاشی نظام ہے جسے لینن نے وضع کیا اور اسٹالن اور اس کے ساتھیوں نے نافذ کیا۔

مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی نگہِ بصیرت نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ خدا کی نفی اور جذبۂ محرکہ کا فقدان، جلد یا بدیر اس نظام کو لے ڈوبے گا اور وہی ہوا۔

(سلیم کے نام خطوط، جلد اوّل ۱۹۶۹ء)

اپنی قرآنی بصیرت کی بدولت، انہوں نے اشتراکی دنیا کو اس نظام کے مضمرات سے آگاہ کرتے ہوئے یہ نوید بھی سنائی تھی کہ وحیٔ خداوندی جس معاشی نظام کی بشارت دیتی ہے، وہ انسان کو اس مقام سے آگے لے جاتا ہے، جہاں مارکس ناکام رہ گیا۔ مفکرِ قرآن کا یہ مقالہ قارئین کے استفادہ کے لئے بارِ دگر پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر طلوعِ اسلام)

انسان کا طریقہ یہ ہے کہ کرۂ ارض پر اس کی نمود سے پہلے وہ تمام سامان موجود تھا جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا۔ ہوا، پانی، روشنی، حرارت اور زمین میں غذا کے ذخائر ـــــ اور اس کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کے باوجود، کرۂ ارض پر انسانوں کی نصف سے زیادہ آبادی رات کو بھوکی سوتی ہے۔ اس میں شُبہ نہیں کہ بھوک کی یہ شدّت اور کثرت ہمارے زمانے میں بہت زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن مسئلہ یہ آج کا نہیں، قدیم زمانے سے چلا آ رہا ہے۔

ہم تاریخِ انسانی کے ابتدائی ادوار میں دیکھتے ہیں کہ انسانوں کی آبادی بالعموم زمین کے ان خطوں میں ہوتی تھی جہاں کی آب و ہوا گرم اور پانی کی افراط ہو۔ ان طبیعی اسباب کی وجہ سے غذائی پیداوار بکثرت ہو جاتی تھی اور چونکہ آبادی ابھی بہت کم تھی، اس لئے اس زمانے میں روٹی کا مسئلہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہی وہ دور تھا جسے قرآنِ کریم نے قصۂ آدم کے تفصیلی انداز میں جنتِ ارضی کی زندگی کہہ کر پکارا ہے۔ جس میں کیفیت یہ تھی کہ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) جہاں کسی کو بھوک لگی، پیٹ بھر کر کھانے کو مل جاتا۔ اس وقت "میری" اور "تیری" کی تمیز اُٹھی ہی نہیں تھی۔ ہم تاریخ میں ذرا آگے بڑھتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ زور آور انسانوں نے کمزور انسانوں کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے جو ان کے لئے خوراک پیدا اور جمع کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ انہیں اس زمانے میں غلام اور دورِ حاضر میں محنت کش یا مزدور کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نوعِ انسان کی تاریخ میں وہ دن سیاہ ترین تھا، جب ایک غلام نے اپنے آقا کے لئے اس سے زیادہ پیدا کر دیا، جتنا اس پر خرچ آتا تھا۔ اس دن نظامِ سرمایہ داری کی پہلی اینٹ رکھی گئی۔ اور اس کے بعد یہ روش اس طرح پھیلی اور مستحکم ہوئی کہ آقا اور غلام کا یہ فرق، فطرت کا تقاضا اور خدا کا منشا تسلیم کیا جانے لگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف منظم فکرِ انسانی کا ابوالآباء افلاطون (PLATO) انسانوں کی جو طبیعی تقسیم کرتا ہے، تو اس میں ایک طبقہ غلاموں کا قرار دیتا ہے۔ یہی نظریہ ارسطو کا تھا۔ دوسری طرف ہم قدیم ہندو مذہب کو دیکھتے ہیں، تو اس میں برھما کے پیدا کردہ ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم میں شودر (محنت کش) سب سے نچلے درجے میں رکھے جاتے ہیں اور اسے دھرم کا تقاضا اور خدا کا فیصلہ قرار دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں جب ہر فرد یا خاندان، اپنے لئے آپ خوراک پیدا کرتا تھا، تو وہ اتنا رقبۂ زمین ہی اپنی تحویل میں رکھتا تھا، جتنے پر وہ محنت کر سکے یا جو اس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہو۔ بعد میں، جب اس نے غلاموں (محنت کشوں) سے کام لینا شروع کیا، تو ان رقبوں کو بھی وسیع کرنا شروع کر دیا۔ اس سے وسائلِ رزق پر ذاتی ملکیت کے تصور نے جنم لیا اور میری اور تیری کی تفریق و تمیز وجود میں آ گئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جن لوگوں نے زمین کے وسیع رقبوں کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ ان کے پاس ان کی ضروریات سے زاید سامانِ زیست جمع ہو گیا اور اسی نسبت سے وہ کمزور ان کے تابع فرمان ہوتے گئے جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے ان کے محتاج تھے۔ اسی سے باہمی رقابتوں، کش مکشوں، آویزشوں، فساد انگیزیوں اور خون ریزیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو گیا، جسے قرآنِ کریم نے بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ (۲/۳۶) کا لازمی نتیجہ قرار دیا ہے۔ انسانوں کے یہ باہمی تصادمات افراد سے بڑھ کر خاندانوں، خاندانوں سے قبیلوں، قبیلوں سے نسلوں اور نسلوں سے قوموں تک پہنچے۔ یہ ہے وہ مقام، جہاں آج انسان اس حالت میں کھڑا ہے کہ

اس کا جسم لہولہان اور اس کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ـــــ آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ انسانی فکر نے اس مسئلہ کو حل کرنے کی جس قدر کوشش کی، یہ اور اُلجھتا گیا۔ اس کی اس وقت تک کی کاوشوں کے سلسلۂ دراز کی آخری کڑی وہ نظریہ، تحریک یا نظام ہے جسے کمیونزم یا سوشلزم کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پیشتر اس کے کہ ہم اس نظریہ یا نظام پر تفصیلی گفتگو کریں، ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم مغربی مفکرین کی ان کوششوں پر طائرانہ سی نگاہ ڈال لی جائے جو اس باب میں اس سے پہلے کی گئیں تاکہ اس پس منظر میں، یہ نظریہ زیادہ اجاگر ہو کر سامنے آسکے۔

مغربی مفکرین کی کوشش

ہم نے بات شروع کی تھی یونانی مفکر افلاطون سے۔ اس نے کہا کہ اس فساد کا سرچشمہ زمین کی غلط تقسیم ہے۔ اس کا حل اس نے یہ بتایا کہ ہر فرد کو زمین کا ایک ٹکڑا دے دیا جائے جو مستقل طور پر اس کی تحویل میں رہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے صرف ایک وارث کی طرف منتقل ہو۔ اس زمین کی پیداوار اس فرد کے خاندان کی مشترکہ ضروریات پوری کرے۔ بالفاظِ دیگر اس نے اشتراک (کمیونزم) کا تصور تو دیا، لیکن جہاں تک زمین کا تعلق ہے، اسے محدود رکھا خاندان تک۔ لیکن اس نے کاشتکاروں کے ان خاندانوں کو امورِ مملکت میں دخل انداز نہیں ہونے دیا۔ حکومت کو اس نے مفکرین اور شمشیر زنوں تک محدود رکھا۔

افلاطون کے شاگرد، ارسطو نے اس نظریہ کی مخالفت کی اور کہا کہ مشترک ملکیت میں کم سے کم چیزیں رکھی جائیں اور زیادہ سے زیادہ چیزیں افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دی جائیں۔

لیکن افلاطون کا نظریہ تھا یا ارسطو کا، یہ دونوں ناکام رہے۔ اس لئے کہ یہ دونوں، غلاموں (محنت کشوں) کے وجود کو فطرت کا منشاء اور انسان کی تمدنی زندگی کا لازمی تقاضا قرار دیتے تھے۔ اسی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ انسان بدستور دو گروہوں میں بٹے رہے ـــ ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا اور دوسرا طبقہ ان کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں کا، جنہیں قرآنِ کریم مترفین کہہ کر پکارتا اور انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیتا ہے۔

اب ہمیں آگے بڑھ کر سولہویں صدی کے یورپ میں پہنچ جانا چاہیئے۔ جب اس مسئلہ (یعنی معاشیات) نے ایک الگ اور مستقل شعبۂ علم کی حیثیت اختیار کی تھی۔ اس وقت وہاں وہ معاشی نظام رائج تھا جسے عام طور پر مرکنٹلزم (MERCANTALISM) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ یہ نظام وہاں اٹھارویں صدی تک رائج رہا۔ اسے بہ حیثیت ایک معاشی نظریہ کے سب سے پہلے اٹلی کے ایک صاحبِ قلم (SERRA) نے ۱۶۰۳ء میں پیش کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوتھر کی تحریکِ اصلاحِ کلیسا کے بعد یورپ میں (HUMANISM) کا دور دورہ تھا۔ اس فلسفہ کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ذاتی مفاد (SELF - INTEREST) کے سوا کوئی ایسا جذبہ نہیں جو انسان

کوئی کام کے لئے آمادہ کردے۔ لہٰذا مفادِ خویش ہی وہ اصول ہے جو کاروبارِ حیات میں حرکت پیدا کرتا ہے اور اسے راہنمائی دیتا ہے اور مفادِ خویش کا تحفظ ذاتی ملکیت کے سوا کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ اس فلسفہ کا ایک نامور مؤید، ہابز تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ انسان کو حیوانات پر شرف اور امتیاز ہی اس لئے حاصل ہے کہ اس کے ہاں ذاتی ملکیت کا تصور ہے۔ مرکنٹلزم کے معاشی نظام کی عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوئی لیکن انہوں نے ذاتی ملکیت کے تصور کو آگے بڑھا کر، قومی ملکیت تک پہنچا دیا اور کہا کہ مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسری قوموں سے اس طرح تجارت کرے کہ ان کی دولت کھینچ کر اپنی قوم کی ملکیت میں آجائے آپ نے دیکھا کہ اس معاشی نظام کی بنیاد خالصتاً مادیت یعنی مفادِ خویش پر ہے، خواہ وہ مفاد ایک فرد کا ہو، یا ایک قوم کا، انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ دوسروں پر کیا گزرتی ہے۔ اس کا نام (CAPITALISM) یا نظامِ سرمایہ داری ہے۔

اٹھارویں صدی کے وسط میں اس نظریہ کے خلاف شدید ردِ عمل ہوا اور فرانس کے مفکرین کے ایک گروہ نے ایک اور نظام کا نظریہ پیش کیا جو (PHYSIOCRACY) کی اصطلاح سے متعارف ہوا۔ اس کے معنی ہیں فطرت کی حکمرانی۔ بنیادی طور پر اس کا مفہوم یہ تھا کہ نظام وہی صحیح قرار پا سکتا ہے جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، فطرت کا عطا کردہ ہو۔ لیکن چونکہ نہ فطرت کا کوئی متعین مفہوم ان کے سامنے تھا، نہ نظامِ فطرت کا۔ اس لئے ان کا اوّلین مطالبہ یہ تھا کہ فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہونی چاہیئے اور حکومت کو اس کے معاملات میں کم از کم دخیل۔ اسی نظریہ کو عدم مداخلت یا (LASSEZ - FAIRE) کہا جاتا ہے ــــ جہاں تک اس کے معاشی نظام کا تعلق ہے، وہ ان کے ایک مشہور راہنما (TURGOT) کا وضع کردہ ہے۔ اس نظریہ کی رُو سے، معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہو جاتا ہے ــــ ایک طبقہ پیدا کرنے والوں کا اور دوسرا طبقہ "بانجھ"۔ اس کے نزدیک پیدا کرنے والا طبقہ صرف کاشتکاروں کا ہے۔ باقی لوگوں کی زیست کا دارومدار اس پیداوار پر ہے جو کاشتکار کی ضروریات سے زائد ہو۔ چنانچہ ان کے ہاں کا مشہور مقولہ ہے۔ "غریب کاشتکار، غریب مملکت، غریب بادشاہ"۔ ان کے نزدیک معیشت کا بہترین نظام، مبادلۂ اشیاء (BARTER SYSTEM) ہے۔ ایک شخص کے پاس گیہوں ہے، لیکن اسے ضرورت تیل کی ہے۔ دوسرے پاس تیل ہے اور اسے گیہوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا، وہ گیہوں اور تیل کا باہمی تبادلہ کر لیتے ہیں اور اس طرح دونوں کی ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کے پاس اتنا تیل فالتو ہے جتنے کی کسی کو ضرورت نہیں، تو اس کے لئے اس فاضلہ جنس (تیل) کا سنبھال کر رکھنا ایک مسئلہ ہو جائے گا۔ ان کی تحقیق کی رُو سے اس مسئلہ کے حل کے لئے چاندی سونے کے ٹکڑوں کو استعمال میں لایا گیا۔ اس طرح "سکّہ" کا وجود عمل میں آیا۔

شروع شروع میں لوگ، ایک دوسرے سے مانگ کر سکوں کو استعمال کر لیتے تھے لیکن رفتہ رفتہ سکہ کے مالکوں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ہم اپنے سکے، دوسروں کے استعمال کے لئے مفت کیوں دے دیں۔ چنانچہ انہوں نے ان کے استعمال (USE) کا معاوضہ لینا شروع کر دیا۔ اس کا نام سود یا (USURY) تھا۔ ترگوٹ کے نزدیک بانجھ طبقوں میں بدترین طبقہ وہ تھا جو پیدا کچھ نہیں کرتا تھا اور دھات کے چند ٹکڑوں کے استعمال کے معاوضہ پر زندگی گزارتا تھا۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ پیداوار کے حقیقی سرچشمہ، یعنی کاشتکار کو معاشرہ میں بلند ترین مقام ملنا چاہیئے، حتیٰ کہ حکام سے بھی برتر۔ وہ ان کا شمار بھی "بانجھ" طبقہ میں کرتا تھا۔

ممکن ہے (PHYSIOCRATS) کا نظریہ زیادہ پھیل جاتا لیکن عین اس زمانے میں سکاٹ لینڈ میں ایک مفکر پیدا ہوا جو دیگر تمام مفکرین پر چھا گیا۔ اس کا نام ہے (ADAM SMITH) جس کی کتاب (THE WEALTH OF NATIONS) نے عالمگیر شہرت حاصل کر لی۔ یہ کتاب

نظامِ سرمایہ داری

درحقیقت نظامِ سرمایہ داری کی بائبل ہے۔ اسمتھ کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ دولت کا سرچشمہ زمین نہیں، صنعت کاری (انڈسٹری) ہے۔ اس سے مغرب کے نظام کارخانہ داری کی بنیاد پڑی۔ وہ کہتا ہے کہ جو قوم ایسی چیزیں تیار کرے، جن سے دوسرے لوگوں کی ضرورتیں بڑھتی جائیں، اس کے پاس دوسروں کی دولت کھنچی چلی آئے گی۔ وہ فرد کی ذاتی ملکیت پر کسی قسم کی پابندی کو جائز قرار نہیں دیتا۔ اس کا نظام خالصتہً مادہ پرستانہ ہے۔ اس کے سامنے کوئی اخلاقی تصور نہیں۔ اسمتھ کے متبعین میں بینتھم، مالتھوس، ریکارڈو وغیرہ نے اس کے نظریہ کو مزید تقویت پہنچائی اور یورپ میں نظامِ سرمایہ داری آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس نظام نے محنت کشوں کے خون چوسنے کے جذبہ کو کس حد تک شدید اور ناقابلِ تسکین بنا دیا تھا، اس کا اندازہ اس دور کے لٹریچر سے بخوبی لگ سکتا ہے۔ مثلاً (DEFOE) نے ۱۷۰۴ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا جس میں لکھا کہ "غریبوں کی مدد بالکل نہیں کرنی چاہیئے۔ ان کی اگر مدد کی گئی، تو وہ سہل انگار ہو جائیں گے اور اگر انہیں سرکاری اداروں میں کام پر لگایا گیا، تو اس کا اثر پرائیویٹ اداروں پر بہت برا پڑیگا۔ اس لئے انہیں ان کی حالت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ وہ اپنا رزق آپ تلاش کریں اور کام نہ ملنے کی صورت میں فاقہ کشی کریں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد (MANDEVILLEE) نے اپنی کتاب (FABLE OF THE BEES) شائع کی جس کا ملخص یہ تھا کہ:۔

> غریبوں سے کام لینے کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ انہیں محتاج رکھا جائے۔ عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی ضروریات کو تھوڑا تھوڑا پورا کیا جائے۔ انہیں ضروریاتِ زندگی کی طرف سے بے نیاز کر دینا حماقت ہے۔ سوسائٹی کی خوشحالی کا راز اسی میں

ہے کہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد تباہ حال اور مفلس رہے۔

اٹھارویں صدی کے آخر میں برطانیہ میں یہ سوال پیدا ہوا کہ دیہی آبادی کس طرح مجبور کیا جائے کہ وہ شہروں میں آکر کارخانوں میں مزدوری کریں۔ اس باب میں (WILLIAM TOWNSEND) نے ۱۷۸۵ء میں اپنی کتاب (DESSERTATION ON THE POOR LAWS) میں لکھا کہ:۔

> بھوک کا کوڑا ایسا سخت ہے جو وحشی سے وحشی اور تند خو سے تند خو جانور کو بھی رام کر دیتا ہے۔ اس سے سرکش اور سرکش انسان بھی مطیع و فرمانبردار بن جاتا ہے۔ اس لئے اگر تم غریبوں سے کام لینا چاہتے ہو، تو اس کا ذریعہ فقط ایک ہے، یعنی بھوک ـــ بھوک ہی وہ جذبۂ محرکہ ہے جس سے غریب اور محتاج ہر قسم کا کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں۔

یہ تھی وہ فضا جسے نظامِ سرمایہ داری نے پیدا کر دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ فضا عام ہو چکی تھی، لیکن اس کے باوجود معاشرہ میں کچھ انسان تو ایسے ضرور ہوتے ہیں، جن کے سینے انسانی جذباتِ ہمدردی سے یکسر خالی نہیں ہو جاتے۔ چنانچہ وہاں بھی ایسے انسان پیدا ہوئے۔ غریبوں اور ناداروں کے

ردِّ عمل

خلاف نظامِ سرمایہ داری کی اس شدت نے، اس قسم کے انسانوں کے جذباتِ ہمدردی کو بیدار کر دیا۔ ان میں سب سے پہلے ہمارے سامنے (SAINT SIMON) آتا ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ محنت کش طبقہ کی جسمانی اور تعلیمی حالت میں خوشگوار تبدیلی پیدا کی جائے اور معاشرے کی از سرِ نو تنظیم اس طرح کی جائے کہ تمام افراد کام کریں اور کوئی شخص بیکار بیٹھ کر دوسروں کی محنت پر زندگی بسر نہ کرے۔ اس کے متبعین میں بعض گرم رَو بھی تھے، جو چاہتے تھے کہ سرمایہ دار طبقہ کو یکسر مٹا دیا جائے اور مزدوروں میں زیادہ سے زیادہ اشتراکیت اور اجتماعیت کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ان میں سب سے نمایاں شخصیت رابرٹ اوون (ROBERT OWEN ۱۷۷۱ – ۱۸۵۸) کی ہے۔ اس کی فکر کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ وہ اپنا کیریکٹر خود نہیں بناتا۔ اس کا معاشرہ اس کا کیریکٹر تشکیل کرتا ہے۔ اوون ایک نظری مفکر ہی نہیں تھا، عملی مصلح تھا۔ چنانچہ اس نے گلاسگو کے قریب مزدوروں کے لئے ایک کارخانہ قائم کیا۔ اس کے پاس ہی ان کی بستی بسائی۔ ان کے لئے عمدہ رہائش گاہیں تعمیر کیں، مدرسے کھولے، ان کے حفظانِ صحت کا انتظام کیا۔ وہ کہتا تھا کہ سرمایہ دار کے لئے پانچ فیصد سے زیادہ منافع نہیں ہونا چاہیئے، باقی سب مزدوروں کی بہبود پر صرف ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ دار طبقہ کی طرف سے اس کی مخالفت ہونی تھی، سو ہوئی اور بڑی شدت کے ساتھ ہوئی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ پاگل ہے اور وہ کہتا تھا کہ یہ سب پاگل ہیں ـــ جوں جوں اس کی مخالفت بڑھتی گئی، وہ اور متشدد ہوتا گیا۔

چنانچہ اس کے بعد اس نے مذہب کی بھی مخالفت شروع کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ اس قسم کے تمام باطل نظریوں کا ذمہ دار مذہب ہے۔ اس سے اس کے دوستوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا۔ یہ نظریہ اوون ہی کا ہے کہ انسان کی ترقی کے راستے میں تین بڑے موانع ہیں۔ ذاتی جائداد، مذہب اور شادی۔ اس کا خیال تھا کہ صحیح اشتراکی زندگی میں ان تینوں کو مٹا دینا ہوگا۔

اسی قسم کا ایک اشتراکی ریفارمر فرانس کا رہنے والا لوئی بلان (LOUIS BLANC) تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ ہر فرد کے لئے کام مہیا کرے اور یہ کہ مزدوروں کو ان کی محنت کے مطابق ہی معاوضہ نہیں ملنا چاہیئے، بلکہ اتنا زیادہ ملنا چاہیئے جس سے ان کی تمام ضروریاتِ زندگی پوری ہو جائیں۔

اس جماعت کا ایک اور ممتاز فرد پرادھن (PROUDHAN ۱۸۰۹ — ۱۸۶۵) تھا۔ یہ درحقیقت مارکسی اشتراکیت کا طائرِ پیش رس تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ جائیداد درحقیقت چوری ہے اور جائیدادوں کے مالک سب چور ہیں۔ وہ کہتا تھا کہ جائیداد اس طرح بنتی ہے کہ دوسرے لوگ محنت کرتے ہیں اور ان کی محنت کا ماحصل کوئی اور لے جاتا ہے۔ زمین کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ یہ فطرت کا عطیہ ہے جس پر ملکیت کا کسی کو حق نہیں، نہ ہی اسے بٹائی یا پٹہ پر دیا جا سکتا ہے، اس سے صرف انسان کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں۔

کارل مارکس

یہ تھا وہ ماحول جس میں کارل مارکس نے آنکھ کھولی اور یہ تھے وہ اشتراکین، جنہوں نے کارل مارکس کے لئے زمین ہموار کی۔ مارکس بالخصوص رابرٹ اوون سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ چنانچہ (COLE) جس نے اوون کے سوانحیات مرتب کئے ہیں، لکھتا ہے کہ اشتراکیین کے نزدیک، نظریۂ اشتراکیت مارکس کا پیدا کردہ ہے، لیکن درحقیقت اس کا مصنف اوون ہے، بلکہ ہم کہیں گے کہ اس کا سہرا، اس سے زیادہ پرادھن کے سر ہے۔ بہرحال، یہ تھے وہ مارکس کے پیشرو جن کی فکر سے وہ بہت زیادہ متاثر تھا۔

کارل مارکس (۱۸۸۳ — ۱۸۱۸) یہودی النسل، جرمنی کا باشندہ تھا۔ برلن یونیورسٹی میں وہ ہیگل کے فلسفہ سے متاثر ہوا اور یہی اس کے معاشی فکر کی بنیاد بنا۔ شروع شروع میں اس نے جرمنی ہی میں اپنی فکر کی اشاعت کی، لیکن وہاں کی فضا سازگار نہ رہی، تو وہ پیرس چلا آیا۔ وہاں اس کی ملاقات فریڈرک انجلز سے ہوئی، جو اس کی فکر کا بہت بڑا ستون ثابت ہوا۔ وہیں یہ پرادھن سے بھی ملا اور اس کے خیالات سے بہت متاثر ہوا۔ اسے پیرس سے نکال دیا گیا، تو یہ برسلز چلا گیا اور اس کے بعد لندن، جہاں سے اس کی مشہور کتاب، سرمایہ (CAPITAL) شائع ہوئی، جس نے معاشی فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں مارکس کا فلسفہ ہمارے سامنے آتا ہے، لیکن میں آپ کو فلسفہ کی گتھیوں میں الجھانا نہیں چاہتا، بالخصوص اس

ہے۔ ہمارے پیشِ نظر موضوع سے اس کا بہت کم تعلق ہے۔ عام فہم الفاظ میں، مارکس کے فلسفہ کا ملخص یہ ہے کہ :۔

مارکس کا فلسفہ

(۱) کائنات میں تغیر کا عمل مسلسل جاری ہے۔ یہاں نہ کوئی نظریہ، تصور یا عقیدہ غیر متبدل ہے، نہ کوئی نظام مستقل۔ یہاں ہر شئے تغیر پذیر ہے۔

(۲) دنیا میں ایک معاشی نظام قائم ہوتا ہے، کچھ عرصہ بعد ایک اور نظام اس کی جگہ لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ پھر اس نظام کی جگہ ایک اور نظام لے لیتا ہے، جو اس کی بھی ضد ہوتا ہے۔ یہ سلسلۂ تغیرات و اضداد ازل سے جاری ہے اور ابد تک ساری رہے گا۔

(۳) اس وقت نظامِ سرمایہ داری رائج ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کی جگہ ایک اور نظام لے لے جو اس کی ضد ہو۔ یہ نظام اشتراکیت پر مبنی ہوگا۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو سلسلۂ تغیرات و اضداد کو اس نظم و ضبط کے ساتھ وجود میں لاتی ہے، تو اس نے کہا کہ یہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کی رُو سے ہوتا ہے۔ "تاریخی وجوب" ایک ایسی اصطلاح ہے جو آجتک شرمندۂ معنی نہیں ہوسکی۔ (NECESSITY) یا وجوب کے معنی ہوتے ہیں ایسی بات جو بہرحال ہو کر رہے۔ اسے (HISTORICAL DETERMINISM) بھی کہتے ہیں۔ یعنی تاریخی جبریت۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم سمجھ سکیں یا نہ سمجھ سکیں، ایسا بہرحال ہو کر رہتا ہے۔ کوئی قوت اسے روک نہیں سکتی۔ لہٰذا، نظامِ سرمایہ داری کے لئے اب یہ مقدر ہے کہ وہ مٹ جائے اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے جو اس کی ضد ہو۔ اس سے ایک بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ مارکس بھی اپنے پیشرؤں کی طرح اپنے سینے میں دلِ درد مند رکھتا تھا۔ اس لئے چاہتا تھا کہ وہ نظام، جس نے انسانیت پر اس قدر ظلم و تشدد روا رکھے ہیں، کسی نہ کسی طرح مٹ جائے۔ اس تغیر کے لئے اسے کوئی ایسی اساس نہیں مل سکی جو دلیل و برھان (REASON) پر مبنی ہو، اس لئے اس نے نظریۂ جبریت کے سایہ میں پناہ لے لی، حالانکہ یہ نظریہ ایک ایسی مبہم اندھی قوت کے تصور پر مبنی ہے جس کے سامنے عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک — علامہ اقبالؒ نے مارکس کے اس اندرونی تضاد کو ایک مصرعہ میں واشگاف کردیا ہے، جب کہا ہے کہ

قلبِ او مومن، دماغش کافر است

وہ سینے میں دل تو درد مند رکھتا تھا، لیکن اس کی سوچ غلط تھی۔ اس سلسلہ میں مہاتما بدھ کی بین مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے اپنے معاشرہ پر نظر ڈالی، تو اس میں بے شمار اندھے، لولے لنگڑے، کوڑھی، اپاہج دکھائی دیئے۔ وہ ایک ریاست کے ولی عہد تھے۔ اگر ان کی فکر صحیح ہوتی، تو وہ لوگوں کے ان مصائب کے حقیقی اسباب کی تحقیق کرتے

اور اس تحقیق میں انہیں نظر آجاتا کہ اس کی ذمہ داری خود ان کی ریاست کے نظام پر عائد ہوتی ہے، لیکن ان کی سوچ صحیح نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ دنیا ہے ہی مصیبتوں کا گھر اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ اسے تیاگ کر انسان جنگلوں میں چلا جائے۔ آپ غور کیجئے کہ اس غلط سوچ نے نوعِ انسان کو کس قدر تباہ کر کے رکھ دیا۔ اس نے ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی جو دو اڑھائی ہزار سال سے دنیا کی اس قدر کثیر آبادی کے اعصاب پر مسلط چلا آرہا ہے اور جس نے انہیں شل کر کے رکھ دیا ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ اوون کا نظریہ یہ تھا کہ نظامِ سرمایہ داری مذہب کا پیدا کردہ ہے، اس لئے اس نظام سے رستگاری کے لئے مذہب کا مٹا دینا ضروری ہے۔ مارکس انہی فلاسفروں سے متاثر تھا، اس لئے وہ بھی اسی نتیجہ پر پہنچا اور اس نے بھی یہی کہا کہ نظامِ سرمایہ داری کا تختہ اُلٹنے کے راستے میں مذہب سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لئے اس کا راستے سے ہٹانا از بس ضروری ـــــ سوال یہ ہے کہ وہ اس نتیجہ پر کس طرح پہنچا اور اس کا جواب نہایت آسان اور پیش پا افتادہ ہے وہ یہودی النسل تھا اور یہودیوں کی صدیوں سے یہ حالت چلی آرہی تھی کہ وہ دنیا کی ذلیل ترین قوم بن کر رہ گئے تھے نہ صرف یہ کہ ان کی کہیں اپنی حکومت نہ تھی، ان کے رہنے کا ٹھکانہ تک بھی کوئی نہیں تھا۔ انہیں کہتے ہی (THE WANDERING JEWS) دشت پیما، خانہ بدوش قوم تھے اور ان کی اس حالت کا ذمہ دار وہ مذہب تھا جسے وہ اس تقدس سے سینے کے ساتھ لگائے پھرتے تھے، مارکس سب سے پہلے اس مذہب سے متنفر ہوا۔ اس کے بعد اس کے سامنے عیسائیت آئی۔ یہ وہ مذہب تھا جس کے انسانیت کُش نتائج سے، غیر تو غیر، خود عیسائی بھی چلا اٹھے تھے۔ مشہور مؤرخ اور مفکر رابرٹ بریفو اپنی شہرۂ آفاق کتاب (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:۔

> عیسائیت کا جرم یہ ہے کہ اس نے اپنی ساری تاریخ میں ہمیشہ استبداد کا ساتھ دیا ہے اور اسے تقویت پہنچانے کا ذریعہ بنی ہے۔ سوائے ان حالات کے جن میں خود کلیسا کا مفاد غریبوں کے مفاد کے ساتھ وابستہ ہو گیا تھا، اس نے کبھی اپنا اثر و قوت کمزوروں کی آزادی اور مستبد قوتوں کی روک تھام کے لئے صرف نہیں کیا۔ اس کے برعکس اس نے ہمیشہ جور و ستم اور جور و استبداد کی حمایت کی ہے۔

اس کے بعد بریفو، ہسپانیہ کے پروفیسر (DR. FALTA DE GRACIA) کے الفاظ نقل کرتا ہے:۔

> عیسائیت میں عدل کا تصور بھی اسی طرح نامانوس ہے جس کا ذہنی دیانت کا۔ یہ اس تصورِ اخلاق کے دائرے سے یکسر باہر کی چیز ہے۔ عیسائیت نے ان لوگوں سے تو شفقت اور ہمدردی کا اظہار کیا ہے جن پر ظلم و ستم ہوں، لیکن خود ظلم و ستم کی طرف سے

ہمیشہ چشم پوشی کی ہے...... ذرا سوچئے کہ سینٹ ونسنٹ، فرانس کے اس قید خانہ کا معائنہ کرتا ہے جو دنیا میں جیتا جاگتا جہنم ہے۔ وہ وہاں محبت کا پیغام عام کرتا ہے اور گنہگاروں کو توبہ کی تلقین کرتا ہے، لیکن وہ ظلم و استبداد جس پر اس جہنم کا قیام ہے، اس کا اسے احساس تک نہیں ہوتا۔ ظالموں کے پنجۂ ظلم و استبداد میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں نکلتی رہیں، انسانوں کی زندگیاں اور قلوب و اذہان غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہے، ان کی ہڈیاں چٹختی رہیں، وہ مٹ جائیں، فنا ہو جائیں، عیسائیت فقط اتنا کرے گی کہ انہیں تسلّی کی تھپکیاں دیتی رہے گی، لیکن اس کے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آئے گا کہ اس ظلم و ستم کو کس طرح مٹایا جائے جس کی وجہ سے انسانیت ان مصائب کا شکار ہو رہی ہے۔ ان مظالم کے استیصال اور ان سے انسانوں کی نجات کی ذمہ داری کی طرف سے یہ بالکل آنکھ بند کئے رہے گی۔ (P.P - ۲۳۲ - ۲۳۳)

یہ تھا وہ مذہب جس کے متعلق اس سے پہلے جرمن فلاسفر نیٹشے نے چیخ کر کہا تھا کہ "مجھے اس کے خون سے ہاتھ رنگنے پڑے اور اسے اصلی معنوں میں صلیب دینا پڑا۔" یہی تھا وہ مذہب جس کے خلاف اووَن نے صدائے احتجاج بلند کی اور اس سے مارکس متاثر ہوا۔ ہیگل کا ایک اور شاگرد تھا (FEURBACH) اس نے اپنی کتاب (ESSENCE OF CHRISTIANITY) میں عیسائیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں۔ یہ اینجلز اور مارکس کا بڑا محبوب تھا۔ انہوں نے "مذہب عوام کے لئے افیون ہے" کا نظریہ اسی سے مستعار لیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب تھا ہی ایسا جس کے خلاف ہر دلِ دردمند، سراپا نالہ اور ہمہ تن انقلاب بن جاتا۔ لہٰذا، اگر مارکس نے بھی اس کی مخالفت کی، تو اس میں وہ حق بجانب تھا۔ البتہ اس کے جذبات کی شدت اور سوچ کی غلطی یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ وہ اس مذہب یا اس جیسے دیگر مذاہب کی مخالفت کرتا، اس نے مستقل اقدار، غیر متبدّل اصولِ حیات اور قانونِ مکافاتِ عمل ہی سے انکار کر دیا۔ انہی کے انکار کو خدا ـــــ وحی اور آخرت کے انکار سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:۔

> اخلاق، مذہب، مابعد الطبیعیات اور اسی قسم کے دوسرے تصورات اپنا آزاد وجود کہیں نہیں رکھتے، نہ ان کی کوئی تاریخ ہے، نہ نشوونما۔ بجز اس کے کہ انسان جب اپنے معاشی ذرائع کو نشوونما دیتا ہے، تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے افکار و تخیلات کو بھی بدلتا رہتا ہے۔ (انہی کا نام اخلاق اور مذہب ہے)۔ (دی کیپیٹل)

ہم سمجھتے ہیں کہ ایک اتنے بڑے مفکر سے، جس کی فکر نے نوع انسان کے ایک کثیر حصّہ کو متاثر کرنا اور نہ معلوم کب

تک کرتے چلے جانا تھا، یہ توقع کرنا کچھ زیادتی نہیں ہوگا کہ اس نے جہاں یہودیت، عیسائیت اور بدھمت جیسے مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد ایک نتیجہ اخذ کیا تھا، دنیا کا ایک ایسا ہی عظیم مذہب اس کے سامنے تھا۔ اسے چاہیئے تھا کہ وہ اسے بھی سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ایسا کرنا اس کے لئے چنداں مشکل بھی نہیں تھا، کیونکہ اس مذہب کا ضابطۂ حیات، قرآنِ مجید، دنیا کے کونے کونے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ اگر خالی الذہن ہو کر قرآنِ کریم کا مطالعہ کر لیتا، تو ہمیں یقین ہے کہ اس کی فکر اس قدر تخریبی راستے اختیار نہ کرتی۔ لیکن افسوس ہے کہ اس نے ایسا نہ کیا۔ اس کے لٹریچر میں کہیں قرآن کا نام تک دکھائی نہیں دیتا۔ وہ جذباتی انسان تھا، اپنے جذبات کی شدت کی رَو میں بہہ گیا۔ اس سے انسانیت کو کس قدر نقصان پہنچا، اسے تو چھوڑئیے اس سے خود اس کا وہ نظام جس کے لئے اس نے اس قدر سختیاں جھیلیں اور مصائب برداشت کئے تھے، گونگے کا خواب، شاعر کی تخیّلاتی جنّت (UTOPIA) اور ناممکن العمل فلسفہ بن کر رہ گیا۔ تفصیل اس اجمال کی ابھی سامنے آتی ہے۔

مارکس کا معاشی نظام

مارکس نے کہا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل وہ معاشی نظام ہے جس میں:-

(۱) ذرائع پیداوار ذاتی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہیں ——— اور

(۲) جس میں، ہر فرد اپنی اپنی استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے، اس کی محنت کا ماحصل، معاشرہ کی مشترکہ تحویل میں رہے جہاں سے ہر فرد کو اس کی ضروریات کے مطابق ملتا جائے۔ اس طرح نہ کوئی فرد اپنی ضروریات سے محروم رہے گا اور نہ کسی کے پاس اس کی ضرورت سے زائد باقی بچے گا۔

اس پر، اس کے رفقاء جوشِ مسرت سے اچھل پڑے۔ انہوں نے "پالیا، پالیا" کے شور سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ابنِ آدم کو اب وہ جنّت مل ہی چاہتی ہے، جسے اس نے کھو دیا تھا اور جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے آنسو راندہ وایں سو ماندہ، مارے مارے پھر رہا تھا۔ جب ان کے جذبات کی شدّت میں کمی واقع ہوئی، تو انھوں نے مارکس سے کہا کہ آپ کے پیش کردہ فارمولا کی شقِ اوّل پر تو خیر، کسی نہ کسی طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔ معاشرہ قوت فراہم کرلے، تو وہ ذرائع پیداوار کو، ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھوں سے چھین کر اسے اپنے قبضہ میں لے سکتا ہے، لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس کی شقِ دوم پر کس طرح عمل کیا جا سکے گا، یعنی اس شق پر کہ ہر شخص جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے، باقی دوسروں کے لئے چھوڑ دے، اس کا اتنا حصّہ تو قابلِ فہم ہے کہ جن لوگوں کی ضروریات ان کی

محنت کے ماحصل سے پوری نہیں ہوتی، وہ اس نظام پر لبیک کہہ دیں گے، اگرچہ وہ بھی رفتہ رفتہ اپنی محنت کو کم کردیں گے کیونکہ جب وہ دیکھیں گے کہ ان کی تمام ضروریات معاشرہ کی طرف سے پوری ہوتی ہیں، تو انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ جان مار کر محنت کریں ـــــ لیکن یہ بات تو قطعاً سمجھ میں نہیں آتی کہ جن لوگوں کی محنت کا ماحصل بہت زیادہ ہوگا اور ضروریات کم، وہ اس نظام کی طرف کیوں آئیں گے۔ وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا، جس کی رُو سے وہ جان مار کر محنت کریں ـــــ اور ایک آدھ دن ہی ایسا نہ کریں، عمر بھر ایسا کرتے رہیں، تو اس میں سے کم از کم لیں۔ باقی سب دوسروں کے لئے چھوڑ دیں ـــــ وہ کون سا جذبۂ محرکہ ہوگا جو انہیں اس پر آمادہ کردیگا اور استقامت سے اس پر مسلسل چلاتا رہیگا، ہمیں یہ سمجھا دیجئے۔

مارکس کا عجز اور مارکس کا جواب یہ تھا کہ یہ بات خود میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اس پر تو میرا ایمان ہے کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل یہی ہے، لیکن یہ ممکن العمل کیسے ہوگا، اس کے لئے جذبۂ محرکہ کیا ہوگا، یہ میں نہیں بتا سکتا۔ مارکس کی تحریریں اس حقیقت کی غماز ہیں کہ وہ ان کے مسلسل تقاضوں سے جھلا اٹھتا۔ وہ انہیں (UTOPIANS) خوابوں کی دنیا میں رہنے والا پکارتا اور ان سے کہتا کہ وہ اس بحث کو نہ چھیڑا کریں۔ ان کی پارٹی میں مارکس کے بعد، دوسرے نمبر پر لینن آتا تھا، وہ اس کی طرف رجوع کرتے، تو وہ بھی اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ:۔

> نوعِ انسان کن مراحل سے گزر کر اور کن عملی اقدامات کی رُو سے اس بلند مقصد کو حاصل کرسکے گی، اس کی بابت ہم نہ کچھ جانتے ہیں، نہ جان سکتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی مواد ایسا نہیں جس سے ان سوالات کا جواب دیا جاسکے ..... ایسا کچھ صرف رضامندانہ ہو سکتا ہے۔ کمیونزم میں ایسا ہی ہوگا۔ لیکن یہ ہوگا کیسے اس کی بابت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

(MARX, ENGELS MARXISM; BY LENIN P.P 355– 58)

یہ ہے وہ مقام جہاں مارکس ناکام رہ گیا ـــــ اور یہ اس لئے کہ جن حقیقتوں سے اُسے اس سوال کا جواب ملنا تھا، ان سے اس نے انکار کردیا تھا۔ یہ نتیجہ تھا اس کی "کافرِ دماغی" کا ـــــ اور مارکس ہی نہیں، یہ وہ مقام ہے جس پر آج بھی کمیونزم کا ہر داعی اسی طرح، ششدر و حیران اور خسرونا کام کھڑا ہے۔ ان میں سے بھی کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں کہ وہ جذبۂ محرکہ کیا ہوگا اور کیسے پیدا ہوگا جس کی رُو سے کمیونزم کا نظام ممکن العمل قرار پا سکے گا۔

مارکس اور اس کے رفقاء کی یہی ناکامی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے طے کیا کہ ہمیں کمیونزم کے نظام کو چھوڑ

سوشلزم سردست اس فارمولا کی شقِ اوّل کو اپنانے کی کوشش کرنی چاہیئے، یعنی اس شق پر عمل پیرا ہونے کی کہ ذرائع رزق، ان کے موجودہ مالکوں کے ہاتھ سے چھین کر اسٹیٹ کی تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اسے سوشلزم کہا جاتا ہے۔ جیسا کہ مارکس کے رفقاء نے کہا تھا، اس شق پر قوّت تشدّد کی رُو ہی عمل کیا جا سکتا ہے۔ یہ وجہ ہے جو سوشلزم اور تشدّد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ لینن اپنی کتاب (STATE AND REVOLUTION) میں انجلز کے ایک مقالہ کا اقتباس دیتے ہوئے لکھتا ہے:۔

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رُو سے آبادی کا ایک حصّہ دوسرے حصّہ پر اپنا اختیار و تسلّط، قوّت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی قائم کرتا ہے۔

سوشلزم میں نظامِ حکومت کس قسم کا قائم ہوگا، اس کے متعلق مارکس لکھتا ہے:۔

> نظامِ سرمایہ داری اور کمیونزم کے درمیان، عبوری دَور میں وہ طریق کار فرما ہوگا جس کی رُو سے اوّل الذکر، ثانی الذکر میں بتدریج تبدیل ہوگا۔ اسی نسبت سے اس عبوری دَور (یعنی سوشلزم) میں سیاسی نظام بھی عبوری قسم کا رائج ہوگا۔ اس میں اسٹیٹ محنت کشوں کی ڈکٹیٹرشپ کا نام ہوگا۔ (لینن صـ ۳۴۶)

اس ڈکٹیٹرشپ کے متعلق سٹالن اپنی کتاب لینن ازم میں لکھتا ہے:۔

> ڈکٹیٹر ایک ایسی مختار عام ہستی کا نام ہے جس کا وجود یکسر قوت پر فائز ہو۔ ایسی مطلق العنان ہستی، جو کسی قانون اور ضابطہ کی پابند نہ ہو۔ آئینی نظامِ حکومت کے علمبردار سُن لیں اور اچھی طرح سُن لیں کہ ڈکٹیٹرشپ کے معنی ہیں قوّتِ غیر محدود اور قاہرہ قوّت جو جبر و اکراہ پر مبنی ہو اور جسے آئین و دستور اور قانون و شریعت سے کچھ واسطہ نہ ہو۔

یہ ڈکٹیٹرشپ، عام افرادِ معاشرہ ہی کو جبر و اکراہ سے اپنے قابو میں نہیں رکھے گی۔ خود اپنی پارٹی کا ڈسپلن بھی اسی انداز سے برقرار رکھے گی۔ انقلابِ روس ۱۹۱۷ء میں عمل میں آیا اور لینن نے ۱۹۲۰ء میں کہا کہ:۔

> ا اس حقیقت کو اب ہر ایک نے محسوس کر لیا ہوگا کہ بالشویک، اڑھائی سال تو ایک طرف، اڑھائی ماہ تک بھی برسرِ اقتدار نہیں رہ سکتے تھے جب تک ہماری پارٹی میں متشدّد اور صحیح معنوں میں فولادی ڈسپلن قائم نہ رکھا جاتا۔

اس سے ظاہر ہے کہ مارکسی نظریہ کی رُو سے، سوشلزم کا قیام تشدّد اور قوّت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ تش

قوت خود پارٹی کے اندر بھی کارفرما رہے گا اور یہ سب کچھ ڈکٹیٹر کے قاہرانہ اختیارات کی رو سے ہوگا ـــــ تشدد ہی نہیں بلکہ اس میں کسی قسم کے ضابطہ اخلاق کی بھی پابندی نہیں ہوگی۔ لینن نے ۱۹۲۰ء میں یوتھ کمیونسٹ لیگ کی تیسری کانگریس میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ہم ان تمام ضوابطِ اخلاق کو مسترد کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت سرچشمہ (یعنی وحیٔ خداوندی) یا غیر طبقاتی تصور کے پیدا کردہ ہوں۔ ہم اعلانیہ کہتے ہیں کہ اخلاقیات کا اس قسم کا تصور فریب ہے۔ یہ تصور، زمینداری اور سرمایہ داری کے مفاد کی حفاظت کی خاطر محنت کشوں اور کاشت کاروں کے دلوں کو تاریکی اور دھند میں رکھنے کے لئے وضع کیا گیا ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا ضابطہ اخلاق محنت کشوں کی طبقاتی جنگ کے مفاد کے تابع ہے۔ یہی ہمارے ضابطہ اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ سرمایہ داروں کا دعویٰ ہے کہ ان کا ضابطہ اخلاق احکامِ خداوندی پر مبنی ہے (ہم اس تصور کو ٹھکراتے ہیں)۔ ہم خدا کی ہستی ہی کے قائل نہیں۔ اخلاق، انسانی معاشرہ ہی کا نام ہے۔ اس کے ماورا جو کچھ ہے، فریب ہے۔ ہم کسی ابدی صداقت کے قائل نہیں۔ اس قسم کے اخلاق کے متعلق جس قدر افسانے وضع کئے گئے ہیں، ہم ان سب کا پردہ چاک کرکے رکھ دیں گے۔　　(مارکس، انجلز، مارکسزم صہ ۶۵ــ ۴۶۱)

جس طرح ہم تشدد کے متعلق بتا چکے ہیں کہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی (یا ڈکٹیٹر شپ) کی طرف سے عوام پر ہی روا نہیں رکھا جائے گا بلکہ خود اپنی پارٹی میں بھی انہی آہنی زنجیروں کے ذریعے ڈسپلن قائم رکھا جائے گا۔ اسی طرح جھوٹ، فریب دہی اور دیگر اخلاقی حدود شکنی بھی، عوام تک ہی محدود نہیں رکھی جائے گی، پارٹی کے اندر بھی یہی روش رہے گی۔ (GOLLANCS) نے اپنی کتاب (OUR THREATEND VALUES) میں لکھا ہے کہ جب مشہور اشتراکی راہنما (DR. G. LUCKNS) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے افراد سے بھی جھوٹ اور فریب دہی سے کام لیں، تو اس نے کہا:

> اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی ہے جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

ہم سمجھتے ہیں کہ یہ وہ انتہا ہے جس پر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کے گروہ بھی نہیں پہنچے تھے۔ ان کا اپنا ایک آئین اور ضابطہ اخلاق ہوتا تھا جس پر وہ پارٹی کے اندر بڑی سختی سے عمل کرتے تھے، لیکن سوشلزم ایسا نظام ہے جو تشدد، جھوٹ

فریب، بددیانتی، عہد فراموشی میں، اپنے اور پرائے، کسی میں بھی تمیز نہیں کرتا۔ آپ جب کسی کمیونسٹ سے بات کریں اور اس سے کہیں کہ کیا یہ ہے وہ نظام، جسے آپ نوعِ انسان کی بہبود کے لئے دنیا میں رائج کرنا چاہتے ہیں، تو وہ جواب میں کہہ دے گا کہ تشدد ہو یا اخلاق باختگی، اس سے معاشی عدل تو قائم ہو جائے گا۔ طبقاتی تقسیم کا تو خاتمہ ہو جائے گا۔ ہمیں ذرائع کو اہمیت نہیں دینی چاہیئے۔ اس مقصد کو اہمیت دینی چاہیئے جس کے حصول کے لئے وہ ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ (MEANS ARE JUSTIFIED BY THE END ACHIEVED) قطع نظر اس کے کہ جس میکیاولی مقولہ کو یہ لوگ اس طرح ایک حقیقتِ مسلمہ کے طور پر پیش کر دیتے ہیں، وہ کہاں تک صحیح ہے ـــــ سوشلزم میں، اس قسم کے انسانیت سوز اور حدود فراموش ذرائع سے وہ مقصد بھی حاصل نہ ہوا، نہ ہی ہو سکتا ہے جس کے حصول کے لئے یہ ذرائع استعمال کئے جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے کمیونسٹوں میں شاید ہی ایسے ہوں (اور اگر ایسے ہوں گے بھی تو بہت کم) جنہوں نے کمیونزم یا سوشلزم کا علمی سطح پر مطالعہ کیا ہو۔ یہ بالعموم جذباتی ہوتے ہیں اور محض سنی سنائی باتوں کو دہراتے رہتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اور تو اور خود مارکس نے کہہ دیا تھا کہ سوشلزم کی رو سے معاشی عدل حاصل نہیں ہو سکے گا۔ سنئے، اس نے اس باب میں کیا کہا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ:۔

> لوگوں کی صلاحیتیں اور حالات مختلف ہیں، کوئی طاقت ور ہے کوئی کمزور، کوئی شادی شُدہ ہے کوئی مجرّد، کسی کے بچے کم ہیں کسی کے زیادہ، لیکن سوشلزم کے اصولِ تقسیم کی رُو سے ایک کو زیادہ ملے گا دوسرے کو کم۔ لہٰذا، ایک مقابلتہً امیر ہوگا، دوسرا غریب۔ اس لئے (لینن کے الفاظ میں) اس نظام میں مساوات اور عدل نہیں ہوگا۔ اس میں دولت کا تفاوت اور غیر منصفانہ تفاوت باقی رہے گا۔ (مارکس کے الفاظ میں) یہ اس نظام (سوشلزم) کا بہت بڑا سقم ہے، لیکن اس عبوری دَور میں (یعنی جب تک سوشلزم کا نظام قائم رہے گا۔) یہ سقم باقی رہے گا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔
>
> (لینن ص ۵۴-۳۵۱)

یہ ہے سوشلزم کا ماحصل خود مارکس اور لینن کے الفاظ میں ـــــ اور اس کا ثبوت ہر وہ ملک پیش کر رہا ہے جہاں سوشلزم رائج کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ کہیں کامیاب نہیں ہو سکا۔ جس نظام میں طبقاتی تفاوت بدستور باقی رہے اور معاشی عدل قائم ہی نہ ہو سکے، اسے آپ کب تک ڈنڈے کے زور پر قائم رکھ سکیں گے۔ یہ حضرات جھٹ سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ دیکھئے! یہ نظام چین میں کس حسن و خوبی سے چل رہا ہے؟ انہیں کون بتائے کہ چین میں یہ نظام اپنی خوبیوں کی وجہ سے نہیں چل رہا، یہ محض ماؤ کی شخصیت کی وجہ سے چل رہا ہے۔ اس قوم نے

نے اس سربراہ کو اپنا معبود بنا رکھا ہے، وہ اس کی پرستش کرتے ہیں اور اس کی "لال کتاب" کو آسمانی صحیفہ سے بھی زیادہ مقدس سمجھتے ہیں۔ وہاں اس نظام کے چلنے کی وجہ ماؤ کی پرستش ہے۔ اس کے بعد دیکھئے گا کہ وہاں بھی کیا ہوتا ہے؟ یاد رکھئے! کوئی ایسا نظام جو محکم بنیادوں پر استوار نہ ہو اور محض شخصیتوں کے سہارے چل رہا ہو کامیاب نہیں ہو سکتا ـــ سوشلزم کی بنیاد کوئی نہیں۔

مارکس سے آگے

سوشلزم کے متعلق یہ کچھ کہہ لینے کے بعد، ہم اس مقام کی طرف لوٹتے ہیں جہاں مارکس ناکام رہا ہے۔ ہم اس سے متفق ہیں کہ انسانیت کی معاشی مشکلات کا حل اسی اصول پر عمل پیرا ہونے میں ہے کہ:۔

ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرے اور اپنی ضروریات کے مطابق لے۔

لیکن مارکس کو وہ بنیاد نہیں مل سکی جس پر اس نظام کی رفیع الشان عمارت استوار ہو، وہ جذبہ نہیں مل سکا جو اتنے عظیم ایثار کا محرک بن سکے۔ لینن نے کہا تھا کہ ایسا کچھ صرف رضاکارانہ طور پر ہو سکے گا اور اس کے لئے جس جذبہ کی ضرورت ہے، ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیسے پیدا ہو سکے، اور کس طرح قائم رہ سکے گا۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے، انقلابِ روس کے بعد اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ؎

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے — جستۂ او را اساسِ محکمے
داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُمّ الکتاب

آئیے ہم دیکھیں کہ اُمّ الکتاب، وہ اساسِ محکم کس طرح مہیا کرتی ہے۔ اس اساسِ محکم کا نام ہے ایمان۔۔۔۔!

ہمارے ہاں کے (اور شاید باقی دنیا کے) کمیونسٹوں کی بھی کیفیت یہ ہے کہ جونہی ان کے سامنے ایمان یا خدا کا نام لیا جائے، یہ ایک تحقیر آمیز تبسم، بلکہ استہزاء آلود قہقہہ سے اس کا استقبال کرتے اور اس قسم کے رٹائے فقرے بول کر بات ختم کر دیتے ہیں کہ ایمان اندھی عقیدت کا نام ہے۔ جسے خوف سے پیدا کیا جاتا اور جہالت کے سہارے قائم رکھا جاتا ہے۔ اب اس قسم کی توہم پرستیوں کا زمانہ نہیں رہا۔ ہم نے مفاد پرستوں کی کارگہ میں ڈھلے ہوئے ان تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا ہے (وغیرہ وغیرہ۔) وہ اس قسم کے الفاظ دہرا کر اپنی انقلاب پسندی کا رعب گانٹھنا یا علمیت کی دھاک بٹھانا چاہتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارکس اینگلز وغیرہ نے کم از کم عیسائیت کا تو مطالعہ کیا تھا، لیکن ان حضرات نے کسی مذہب کا بھی مطالعہ نہیں کیا ہوتا۔ ان کے مبلغ علم کا منتہیٰ اسی قسم کی سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔ ان حضرات کا سب سے بڑا سوال یہ ہوتا ہے کہ آپ خدا کا وجود ثابت کیجئے ــــ اور "ثابت کیجئے" سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ انہیں بتائیے کہ وہ دیکھئے! سامنے

پہاڑی پر خدا بیٹھا ہے۔ قبل اس کے کہ ہم ان کی خدمت میں عرض کریں کہ ایمان کسے کہتے ہیں اور خدا پر ایمان سے مفہوم کیا ہے، ہم خود ان سے ایک سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ کہ کمیونزم کی بنیاد مارکس کے اس نظریہ پر ہے کہ معاشی تغیرات ایک لگے بندھے قانون کے مطابق رونما ہوتے رہتے ہیں جن میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی قوت ہے جس کی رُو سے ایسا کچھ التزاماً ہوتا رہتا ہے۔ مارکس نے اس کا نام تاریخی وجوب رکھا ہے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا آپ تاریخی وجوب یا اس کی قوتِ محرکہ یا نافذہ کا اسی قسم کا ثبوت پیش کر سکتے ہیں، جس قسم کا ثبوت آپ وجودِ باری تعالےٰ کے متعلق طلب فرماتے ہیں؟ آپ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے، لیکن اس کے باوجود آپ اسے ایک حقیقت اور ابدی صداقت تسلیم کئے جائیں گے۔ آپ سوچئے کہ آپ تاریخی وجوب پر بلا ثبوت اور بلا دلیل ایمان رکھتے ہیں اور اسے اندھی عقیدت سے تعبیر نہیں کرتے، لیکن اگر کوئی اور ایمان کا نام لیتا ہے، تو آپ یہ تحقیق کئے بغیر کہ اس سے اس کی مراد کیا ہے، اس پر اندھی عقیدت کا لیبل لگا کر اُسے استہزاء کے سیلاب میں بہا دینا چاہتے ہیں۔ معاف کیجئے! اس قسم کا اندازِ فکر یا کافی ہاؤس کے تو شایانِ شان قرار پا سکتا ہے علم کی بارگاہ میں نہیں ــــ اب سنئے کہ العلم یعنی قرآنِ کریم کے لغت میں ایمان کا کیا مفہوم ہوتا ہے۔ قرآنی اصطلاح میں ایمان رکھنے والوں کو مومن کہہ کر پکارا جاتا ہے اور مومنین کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ:۔

ایمان

اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا۔ (۲۵/۷۳)

جب ان کے سامنے اور تو اور خود خدا کی آیات بھی پیش کی جائیں، تو یہ بہرے اور اندھے بن کر انہیں قبول کر لیتے۔

فرمائیے! کیا ایسے ایمان کو "اندھی عقیدت" کہا جائے گا؟ اس ایمان (یعنی خدا پر ایمان کی طرف دعوت دینے والے نے پکار کر کہہ دیا تھا کہ اَدْعُوْا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِىْ (۱۲/۱۰۸)۔ "میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں، تو علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیتا ہوں۔ میں بھی ایسا کرتا ہوں اور میرے متبعین کی بھی یہی روش ہوگی۔" ان حضرات کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایک غیر مسلم مترجم (A.J. ARBERRY) "علیٰ بصیرۃ" کا ترجمہ (WITH SURE KNOWLEDGE) کرتا ہے اور ڈاکٹر سید عبداللطیف (مرحوم) ان الفاظ کا ترجمہ (FIRM CONVICTION) کرتے ہیں۔ کہئے! کیا اسے اندھی عقیدت کہا جائے گا؟ وہ اپنے مخالفین سے کہتا ہے کہ میں اپنے دعوے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتا ہوں۔ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱) "اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، تو تم بھی اس

کی تائید میں دلائل پیش کرو۔" ہمارے ہاں، بلا دلیل و برہان نہ کوئی بات منوائی جاتی ہے، نہ مانی جاتی۔ یہ ہے قرآنِ کریم کی رُو سے ایمان سے مفہوم ــــ ایسا محکم یقین جو علم و بصیرت کا پیدا کردہ اور دلائل و بُرہان کی رُو سے پختہ ہو۔

اب آیئے ہستیٔ باری تعالےٰ پر ایمان کی طرف ــــ ہمارے زمانے میں، سائنس (طبیعیات) کی دنیا میں جو مقام ایڈنگٹن (EDDINGTON) کو حاصل ہے، اربابِ علم سے پوشیدہ نہیں۔ وہ اپنی کتاب ــــ (SCIENCE AND THE UN-SEEN WORLD) میں لکھتا ہے:۔

اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں، بلکہ اس امر کا یقین ہے کہ خدا بذریعہ وحی انسانوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ (ص ۴۴)

یعنی وجودِ باری تعالیٰ سے متعلق نظری بحثوں سے آگے بڑھ کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ جس راہ نمائی کے متعلق یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے ملی ہے، وہ کس قسم کی ہے اور اس کی صداقت کا ثبوت کیا ہے۔ جس راہ نمائی کے متعلق ہمارا دعوےٰ ہے کہ وہ وحی پر مبنی ہے، وہ کیا ہے، اس کے متعلق ذرا آگے چل کر بات سامنے آئیگی یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن، اس کے مبنی بر صداقت ہونے کے لئے بھی نظری دلائل کافی نہیں سمجھتا۔ وہ کہتا ہے کہ اسے اس کے نتائج سے پرکھ کر دیکھو۔ اگر اس کے نتائج اس کے دعوےٰ کے مطابق ہیں، تو یہ اس کی صداقت کا ثبوت ہے، اگر ایسا نہیں، تو اس کا دعوےٰ باطل ہے چنانچہ قرآنِ کریم رسول اللہ سے کہتا ہے کہ تم ان لوگوں سے کہو کہ میں نظری بحثوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا۔ ایک نظام میں پیش کر رہا ہوں اور اس کے برعکس دوسرا نظام تم پیش کرتے ہو۔ تمہارا دعوےٰ یہ ہے کہ میرا پیش کردہ نظام کامیاب نہیں ہو سکتا، ہمارا نظام کامیاب ہوگا۔ تمہارے اور میرے دعاوی کو پرکھنے کا طریقہ یہ ہے کہ:۔

اِعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ عَامِلٌ ۔ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ مَنْ تَكُوْنُ لَهٗ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۔ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ (۶/۱۳۶)

تم اپنے پروگرام پر عمل کرو، مجھے اپنے پروگرام پر عمل کرنے دو۔ نتائج خود بخود بتا دینگے کہ کون اپنے دعوےٰ میں سچا ہے اور کون جھوٹا۔

لیکن اتنی بات میں ابھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو نظام ظلم و استبداد پر اور سلب و نہب (EXPLOITION) پر مبنی ہو وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

مبنی بر وحی

یہ ہے وہ راہ نمائی، وہ اصول، جسے وحی نے پیش کیا ہے! سوال یہ ہے کہ اس راہ نمائی کے متعلق یہ کیوں تسلیم کیا جائے کہ یہ وحی پر مبنی ہے۔ یہ کیوں نہ مانا جائے کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق ہے! اس کا جواب بڑا آسان اور واضح ہے۔ فکرِ انسانی (یعنی موضوعِ پیشِ نظر کی نسبت سے) مارکس

نے یہ اصول پیش کیا کہ دنیا میں ہر نظریہ اور ہر نظام تغیر پذیر ہے۔ آج ایک نظام وجود پذیر ہوتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ تک کارفرما رہتا ہے اس کے بعد وہ مٹ جاتا ہے اور اس کی جگہ دوسرا نظام لے لیتا ہے جو اس کی ضد ہوتا ہے — یعنی کچھ عرصہ سے نظام سرمایہ داری کا دور دورہ تھا۔ وہ مداری تماشا دکھا کر چلا جا رہا ہے اور اس کی جگہ، اس کی ضد، اشتراکیت کا نظام قیام پذیر ہو رہا ہے جس کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ یہ نوع انسان کی ان مشکلات کو حل کر دے گا جن سے وہ اس وقت دوچار ہے۔ بہت اچھا ہم مانے لیتے ہیں کہ یہ ایسا ہی ثابت ہوگا، لیکن اس کا کیا علاج کہ جب یہ اپنے نتائج پیش کرے گا، تو اس اصول کے مطابق جسے فکر انسانی نے پیش کیا ہے، اس کے بھی بوریہ بستر باندھنے کا وقت آجائے گا اور اس کی جگہ وہ نظام لے لے گا جو اس کی ضد ہوگا۔ اس کے برعکس، وحی یہ اصول پیش کرتا ہے کہ مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ (۱۳/۱۷) "جو نظام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوگا، وہ ہمیشہ باقی رہے گا" اور یہ وہ اصول ہے جو بالکل تغیر پذیر نہیں، یہ ہمیشہ غیر متبدل رہے گا۔ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ (۱۰/۶۴) "خدا کے بتائے ہوئے اصولوں میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہوگی"۔ ان اصولوں کو مستقل اقدار یا (PERMANENT VALUES) کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

ہم اپنے ان دوستوں سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ وہ دیانتداری سے بتائیں کہ ان کے نزدیک، وہ نظریہ یا فلسفۂ حیات بہتر اور قابلِ قبول ہوگا جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو سکے جو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو، یا ایسا نظریہ یا فلسفۂ حیات، جس کی بنیادوں پر ایسا نظام قائم ہو جو کچھ وقت کے لئے منفعت بخش ہو سکے، اس کے بعد اس نظام کے لئے جگہ خالی کر دے جو اس کی ضد ہو، یعنی جس میں پھر اسی سابقہ ظلم و استبداد اور سلب و نہب و استیصال کا دور دورہ شروع ہو جائے! سوچئے اور پھر دیانتداری سے کہئے کہ ان دونوں میں سے کونسا نظریہ یا فلسفۂ حیات نوعِ انسان کے حق میں بہتر ہوگا؟

بہرحال، بات ہو رہی تھی قرآن کریم کی رُو سے ایمان کے مفہوم کی۔ آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ قرآن کی اصطلاح میں ایمان کسے کہتے ہیں! ایسے اصولوں کی صداقت پر یقینِ محکم جو:۔

۱۔ علم و بصیرت پر مبنی ہوں اور دلائل و براہین ان کی تائید کریں۔
۲۔ جو تمام بنی نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہوں۔
۳۔ جن کے نتائج ان کی صداقت کا ثبوت پیش کریں۔
۴۔ جو غیر متبدل ہوں۔ یعنی ان پر جب بھی عمل کیا جائے، وہ ویسے ہی نتائج برآمد کر سکیں۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (۲/۲۵۶) دین میں جبر و اکراہ کا کوئی کام نہیں۔ جبر و اکراہ سے قلب و دماغ کی مطمئن مندی حاصل ہو ہی نہیں سکتی۔

حیرت ہے کہ یہ حضرات علم و دانش کے اس قدر بلند آہنگ دعاوی کے باوجود (RATIONAL FAITH) اور (IRRATIONAL FAITH) میں تمیز و تفریق نہیں کر سکتے۔ مشہور سائیکالوجسٹ (ERICH FROMM) ان میں فرق کرتا ہوا کہتا ہے کہ:۔

> (IRRATIONAL FAITH) یہ ہے کہ کسی بات کو محض اس لئے تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی اتھارٹی یا لوگوں کی اکثریت ایسا کہتی ہے۔ اس کے برعکس (RATIONAL FAITH) کی اصل و اساس ایک ایسے آزادانہ تیقن (CONVICTION) پر ہوتی ہے جو انسان کے تخلیقی مشاہدہ یا فکر پر مبنی ہو۔ (MAN FOR HIMSELF; P.205)

قرآنِ کریم (RATIONAL FAITH) کو ایمان کہہ کر پکارتا ہے اور (IRRATIONAL FAITH) کی سخت مخالفت کرتا ہے۔

اس کے بعد آپ آجائیے اس مقام کی طرف جہاں مارکس اور اس کے ہم نواؤں نے کہا تھا کہ:۔

> نوعِ انسان کی مشکلات کا حل ایسا نظام ہے، جس میں ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق جان مار کر محنت کرے اور اس کے ماحصل سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے، لیکن ہمیں وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) نہیں ملتا جس کی رُو سے لوگ ایسا کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ یہ جذبۂ محرکہ دل و دماغ کی حاصل رضامندی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیئے۔ شاید نوعِ انسان مزید مراحل طے کرنے کے بعد اس مقام تک پہنچ جائے ــــ اس دوران میں ہمیں بر سبیلِ تنزّل سوشلزم کا نظام رائج کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جسے تشدد اور قوت کی رُو سے قائم کیا جا سکتا ہے۔

قرآنِ کریم نے کہا کہ اس کے لئے نوعِ انسان کو کسی مزید مرحلہ کے طے کرنے کی ضرورت نہیں ــــ یہ جذبۂ محرکہ، دل و دماغ کی یہ کامل رضامندی، مستقل اقدارِ خداوندی پر ایمان سے حاصل ہو سکتی ہے، جسے یہ حضرات اپنی غلط نگہی، تحقیق کی کمی، جذبات کی شدت اور جلد بازی کی وجہ سے مسترد کر چکے ہیں۔ انہوں نے خود ہی کمرے کے اندر سے کنڈی لگا رکھی ہے اور پھر چیخ رہے ہیں کہ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اس نظام میں ہے جس میں:۔

۱۔ تمام افراد کے رزق، ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری اس نظام کے سر ہو جو اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہو۔ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶)۔

۲۔ یہ مقصد اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ بنیادی سرچشمۂ رزق، ارض پر کسی کی ذاتی ملکیت نہ ہو، بلکہ یہ اس نظام کی تحویل میں رہے۔ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۴۵/۲۷)۔

۳۔ اس میں ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق محنت کرے۔ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (۵۳/۳۹)۔

۴۔ اس محنت کے ماحصل میں سے صرف اپنی ضروریات کے لئے لے، باقی سب اپنے دل و دماغ کی کامل رضامندی سے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے چھوڑ دے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۔ قُلِ الْعَفْوَ (۲/۲۱۹)۔

۵۔ بلکہ عند الضرورت، جن کی ضرورت زیادہ ہو، انہیں اپنے آپ پر بھی ترجیح دے۔ وَ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَ لَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۶)۔

۶۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کرے کہ یہ اس کے ایمان کا تقاضا ہے۔ اس کے لئے وہ نہ کسی سے ستائش کا متمنی ہو، نہ صلہ کا امیدوار۔ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا (۷۶/۹)۔

۷۔ اور ایسا عمر بھر کرتا چلا جائے۔ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۳/۱۰۲)۔

ہم پوچھتے ہیں ان حضرات سے کہ اس ایمان میں کون سی بات قابلِ اعتراض ہے اور کون سی شق اندھی عقیدت پر مبنی.....؟

اب ہمارے سامنے یہ سوال آتا ہے کہ ایمان کی وہ کونسی بنیادی شق ہے جس پر قرآن کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے؟ جس قدر یہ سوال اہم ہے، اسی قدر قرآن کی رُو سے اس کا جواب آسان ــــ معاشی نظام کوئی بھی، اس کے دو اہم ستون ہوتے ہیں۔ ایک وسائلِ پیداوار اور دوسرے سامانِ زیست پیدا کرنے کی انسانی صلاحیتیں۔ انہی دو ستونوں کے صحیح ہونے کی صورت میں وہ نظام صحیح ہو سکتا ہے اور انہی کے غلط ہونے سے غلط ــــ اب دیکھئے کہ اس کے لئے قرآنِ کریم وہ کون سا محور تجویز کرتا ہے جس کے قدر، اس نظام کی ساری مشینری گردش کرتی ہے۔ وہ محور ان چار لفظوں پر ایمان ہے کہ:۔

وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔

کس بات پر ایمان؟

آسان ترین زبان میں ان چار لفظوں کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کے وسائلِ رزق ہوں یا انسانی صلاحیتیں۔ ان میں سے کوئی چیز بھی میری اپنی نہیں۔ یہ سب

...ت فرمودہ ہیں۔ یہ میرا ایمان ہے اور اسی کے مطابق عمل پیرا ہونا، میرا نصب العینِ حیات۔ یعنی یہ
... ہے

عشق میں ایک تم ہمارے ہو   باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

... کہ قرآنی سے اس اجمال کی تفصیل طلب اور تلاش کریں۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِی الْعَلِیم۔

اس آیت میں کہا یہ گیا ہے کہ دنیا میں کوئی نعمت ایسی نہیں جو تمہیں خدا کی طرف سے نہ ملی ہو۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے نعمت میں کیا کچھ شامل ہے۔

اس لفظ (نعمت) کے لغوی معنی ہیں، ہر وہ شے جس سے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہو۔ ... و دولت، آسودگی اور خوشحالی، زندگی کی ہر آسائش، نیز سرفرازی اور سربلندی۔ ان تمام مفاہیم کے لئے یہ لفظ آتا ہے۔ اس کے ان معانی پر غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ زندگی کی کونسی خوشگواری اور سربلندی ہے جو اس میں شامل نہیں ہو جاتی اور جب ایک مومن یہ کہتا ہے کہ ان میں سے جو کچھ بھی مجھے حاصل اور میسر ہے، نہ وہ میری ملکیت ہے، نہ ہی میرے کسب و ہنر کا نتیجہ۔ یہ سب خدا کی ملکیت اور اسی کا عطا کردہ ہے تاکہ میں سے اس کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق صرف میں لاؤں۔ اس مقام پر اتنا اور واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ جس چیز کو خدا اپنی کہتا ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی اور اسے اسی کے بتائے ہوئے طریق کے مطابق صرف میں لانا چاہیئے اور دوسرے یہ کہ جن امور کا پورا کرنا خدا اپنی ذمہ داری قرار دیتا ہے، عملاً وہ ذمہ داری اس نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہے جو اس کے متعین کردہ پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے وجود میں آئے۔ اس کو نظامِ خداوندی یا اسلامی مملکت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔

لفظ نعمت کے اجمالی مفاہیم کو آپ نے دیکھ لیا۔ اب دیکھئے کہ قرآنِ کریم عملاً کون کون سی چیزوں کو اس میں شامل کرتا ہے۔ بغرضِ اختصار میں ان میں سے ایک ایک، دو دو مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ان کی تفصیل میری تصانیف میں ملے گی۔

رزق خدا کی نعمت ہے

۱) سب سے پہلے سامانِ زیست (رزق) کو لیجئے۔ اس میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن پر زندگی کی بقا اور استحکام کا دارومدار ہے۔ اس کے متعلق سورۂ فاطر میں اجمالی طور پر کہا کہ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ... ... یَرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ...... (۳۵/۳)۔ "اے نوعِ انسان! تم اللہ کی ان نعمتوں کو ہر وقت سامنے رکھو جن سے اس نے تمہیں نوازا ہے۔ وہ تمہیں آسمانی فضا اور زمینی زرخیزی، دونوں کے ذریعے

سامانِ زیست عطا کرتا ہے۔"

آدیکھئے کہ اس میں وہ تمام چیزیں آگئیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے۔

سورۃ النحل میں ہے کہ خدا نے تمہارے فائدے کے لئے سمندر کو قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا تاکہ تم اس
سے تروتازہ غذا حاصل کرو۔ نیز سامانِ زیبائش و آرائش، مثلاً موتی ــــ پھر زمین کو دیکھو کہ اس میں سے کیا کچھ
حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے بعد کہا کہ یہ تو نعمائے خداوندی کی یونہی دو چار مثالیں ہیں۔ اِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَۃَ
اللّٰہِ لَا تُحْصُوْھَا (۱۴-۱۸/۱۶)۔ اگر تم ان کا شمار کرنا چاہو، تو ان کا کبھی احاطہ نہ کرسکو۔ یہ اس قدر بے حد و
حساب ہیں۔ (نیز ۱۲/۳۵)۔

قرآنِ کریم نے متعدد مقامات پر کشتیوں (جہازوں) کا ذکر کیا ہے کہ وہ اس قدر وزنی سامانِ زیست
لادے ہوئے کس طرح سینۂ بحر پر بطوں کی طرح تیرتی پھرتی ہیں۔ اس قسم کا فطری نظام قائم کر دینا تمہارے
بس کی بات نہ تھی۔ یہ سب خدا کا قائم کردہ ہے اور تمہارے فائدے کے لئے ہے۔ (۳۰/۴۶ ز ۳۱/۳۱
ز ۴۲/۳۲)۔

یہ تو سمندر کی بات تھی۔ اس نے کہا کہ سطحِ ارض کی طرف آؤ اور دیکھو کہ اس نے کس طرح مختلف مویشیوں
کو تمہارے لئے مسخر کر دیا کہ تم ان کا گوشت کھاتے، دودھ پیتے اور ان سے سواری کا کام بھی لیتے ہو۔ (۳۶/۷۲)
ان کی کھالوں کے خیمے بناتے اور ان کی اون سے اپنے لئے لباس اور دیگر ضروریات کی چیزیں بناتے ہو۔ ثُمَّ
تَذْکُرُوْا نِعْمَۃَ رَبِّکُمْ (۴۳/۱۳) "انہیں تم نے تو نہیں بنایا۔ یہ سب تمہارے لئے نشوونما دینے والے
کی طرف سے بطور نعمت عطا ہوئی ہیں۔

بعض مقامات پر ان تفاصیل کو اس قسم کے مختصر الفاظ میں سمٹا کر رکھ دیا کہ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ
اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعْمَہٗ
ظَاھِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً .... (۳۱/۲۰-۲۱) "کیا تم اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ کائنات کی
بلندیوں اور پستیوں میں جو کچھ ہے اس سب کو خدا نے تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور اس طرح کھلی اور
چھپی ہوئی نعمتوں کو عام کر دیا ہے۔" اس کے بعد کہا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ بِغَیْرِ
عِلْمٍ وَّلَا ھُدًی وَّلَا کِتٰبٍ مُّنِیْرٍ (۳۱/۲۰) لیکن اس کے باوجود تم دیکھو گے کہ بعض لوگ خدا کے
متعلق یونہی کج بحثی کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے پاس نہ صحیح علم ہوتا ہے نہ سچی راہنمائی، نہ کوئی واضح ضابطۂ
ہدایت۔ بس یونہی جھگڑتے رہتے ہیں۔

سورۂ جاثیہ میں، سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ کے بعد کہا جَمِیْعًا مِّنْہُ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (۴۵/۱۳) 'ارض وسما میں جو کچھ ہے اسے تمہارے فائدے کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیں، اصل حقیقت تک پہنچنے کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

وہ حقیقت جو ان آیاتِ خداوندی میں بیان کی گئی ہے اور فکر و تدبر کے بعد نکھر کر سامنے آسکتی ہے۔ وہ حقیقت ان دو مختصر لیکن جامع الفاظ میں پوشیدہ ہے۔ ایک تو مِنْہُ اور دوسرے لَکُمْ۔ مِنْہُ کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام وسائل پیداوار، نہ تمہارے پیدا کردہ ہیں، نہ زرخرید ــــ یہ خدا کے پیدا کردہ ہیں اور اس کی طرف سے تمہیں، بلا مزد و معاوضہ، بطور نعمت عطا ہوئے ہیں۔ یعنی وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳)۔ ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے، تمہاری ملکیت نہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ ان تمام آیات میں لفظ لَکُمْ یا لَھُمْ آیا ہے۔ یعنی یہ نعمائے خداوندی یہ سامانِ زیست جو بلا مزد و معاوضہ عطا ہوا ہے، کسی ایک فرد، ایک خاندان، ایک قبیلہ، ایک قوم یا ایک طبقہ کے لئے نہیں، تمام انسانوں کے لئے ہے۔ یہ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ (۹۱/۱۰) ہے۔ یعنی تمام ضرورتمندوں کے لئے یکساں سامانِ زیست مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ (۵۶/۷۳)۔ ہر بھوکے کے لئے خوراک کا سامان۔ وَ مَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا۔ (۱۷/۳۰)۔ جو وسائلِ رزق خدا کی طرف سے نوعِ انسان کو عطیۃً ملے ہوں، کسی کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ان کے آگے رکاوٹیں کھڑی کر دے اور کہہ دے کہ یہ میری ملکیت ہیں ان میں کوئی دخل نہیں ہو سکتا۔

سورۃ النحل میں اس حقیقت کو اور بھی واضح انداز میں بیان کر دیا۔ پہلے ان مختلف چیزوں کا ذکر کیا جو انسانی زندگی کی نشوونما کے لئے ضروری ہیں اور صفحۂ ارض پر بکھری پڑی ہیں۔ اس کے بعد کہا کہ كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ (۱۶/۱۸)۔ اس طرح اس نے تمہیں اپنی تمام نعمتیں عطا کر دیں۔ اب تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم قوانینِ فطرت کے مطابق انہیں حاصل کرو اور اقدارِ خداوندی کے مطابق انہیں نوعِ انسان کی منفعتِ کلّی کے لئے استعمال کرو۔ اسے کہیں گے احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا، اللہ پر ایمان لانا، اسلام قبول کرنا۔ اس کے بعد رسول اللہ سے کہا کہ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (۱۶/۸۱)۔ اگر اس کے بعد بھی یہ لوگ اس حقیقت کے تسلیم کرنے سے کہ یہ سامانِ زیست، تمام انسانوں کے مشترکہ مفاد کے لئے، اعراض برتیں، اس سے گریز کی راہیں نکالیں، اس سے سرکشی اختیار کریں، تو تم نے ان تک صحیح بات پہنچا دی اور نہایت واضح طور پر پہنچا دی۔ اگر یہ اسے تسلیم نہیں

کرتے، تو اس کا نتیجہ خود بھگتیں گے اور اس کے بعد کہا کہ یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَ اَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۱۶/۸۳)۔ بات یہ ہے کہ یہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں۔ اُسے اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں کہ یہ تمام وسائلِ پیداوار خدا کی طرف سے بطور نعمت ملے ہیں۔ یہ مفت ملے ہیں، بلا مزد و معاوضہ ملے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود عملاً اس سے انکار کرتے ہیں اور ان پر اس طرح قابض ہو جاتے ہیں، گویا یہ ان کے زر خرید ہیں۔ یہ کفرانِ نعمت درحقیقت خدا کا انکار ہے۔ یہ اسلام نہیں، کفر ہے۔

میں پوچھنا چاہتا ہوں اپنے ان عزیزوں سے جو خدا اور ایمان کے الفاظ سُنکر شکن برجبیں کف بر دہاں اور نعل بر آتش ہو جاتے ہیں کہ خدا کے اس تصور اور اس پر اس ایمان میں انہیں کون سی بات قابلِ اعتراض نظر آتی ہے ـــــ اور اس کے بعد وہ سوچیں کہ جب ایمان نام ہو کسی صداقت کے برضا و رغبت، بطیبِ خاطر، قبول اور اختیار کرنے کا، تو مارکس اور لینن نے جو کہا تھا کہ ان کے تصورِ کا معاشی نظام صرف ان لوگوں کے ہاتھوں تشکل ہو سکے گا جو اس کے لئے برضا و رغبت آمادہ ہوں، تو کیا قرآنِ کریم کی اس حقیقت پر ایمان رکھنے والے ہی وہ لوگ نہیں ہوں گے جو اسے قائم کر سکیں۔ انہوں نے ہی پہلے اسے قائم کیا تھا، انہی کے ہاتھوں یہ پھر قائم ہو سکے گا۔

۲) ابھی تک بات اتنی ہی ہو رہی تھی کہ سامانِ رزق کا بافراط ملنا، خدا کی نعمت ہے اور اس حقیقت کا تسلیم کرنا کہ یہ سب سامان تمام نوعِ انسان کی پرورش کے لئے بطورِ عطیہ ملا ہے، خدا پر ایمان ہے۔ اب ایک قدم آگے بڑھئے اور نعمت کا ایک اور گوشہ سامنے لائیے۔ سورۂ بقرہ میں بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

اقوامِ عالم پر فضیلت

یٰبَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (۲/۴۷) تم خدا کی اس نعمت کو یاد کرو جب اس نے تمہیں اس سے نوازا تھا۔ یعنی تمہیں تمہاری ہمعصر اقوام پر افضلیت (SUPREMACY) عطا کی تھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی قوم کو، اس کی ہمعصر اقوام میں، ممتاز حیثیت حاصل ہونا بھی خدا کی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل کو یہ نعمت اس وقت حاصل ہوئی تھی جب اس نے اپنی اجتماعی زندگی کو اقدارِ خداوندی کے قالب میں ڈھالا تھا اور اس طرح وہ قوم شوکتِ سلیمانیؑ اور سطوتِ داؤدیؑ کی وارث قرار پا گئی تھی۔ یہی وہ نعمت تھی جس کے پیشِ نظر حضرت سلیمانؑ نے کہا تھا کہ رَبِّ اَوْزِعْنِیْۤ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَ عَلٰى وَالِدَیَّ (۲۷/۱۹) "اے میرے نشو و نما دینے والے! مجھے توفیق عطا فرما کہ میں تیری اس نعمت کا شکریہ ادا کروں، جس سے تُو نے مجھے اور میرے آبا و اجداد کو نوازا ہے۔" وہ شکرِ نعمت اس طرح ادا ہوگا وَ اَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَ اَدْخِلْنِیْ بِرَحْمَتِكَ فِیْ عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (۲۷/۱۹) میں

ایسے کام کروں جو عالمگیر انسانیت کو سنوارنے والے ہوں اور چونکہ ایسا کچھ صرف اجتماعی نظام کی رُو سے ممکن ہوگا، اس لئے مجھے ایسی جماعت کا فرد بنا دے جو تیرے پروگرام کے مطابق اس فریضہ کو سرانجام دے۔

اس سے ظاہر ہے کہ آسائش و کشائش رزق ہی نہیں، بلکہ اقوامِ عالم پر فضیلت بھی خدا کی نعمت ہے، لیکن یہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب ایسا نظام قائم کیا جائے جو تمام نوعِ انسان کے لئے منفعت بخش ہو۔ جب جماعتِ مومنین سے کہا گیا تھا کہ وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (۳/۱۳۹) تو اس سے یہی مراد تھی کہ جب تک تم مومن رہو گے، تم پر دنیا کی کوئی قوم غالب نہ آ سکے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ جو قوم اس نظام کو قائم کر دے جس میں نہ کوئی کسی کا محتاج ہو نہ محکوم، تو يَدْخُلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا۔ (۱۱۰/۲)۔ لوگ فوج در فوج اس میں داخل ہوتے جائیں گے۔ اس قوم کو ایسی قوت اور فضیلت حاصل ہو جائے گی کہ دنیا کی کوئی قوم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گی۔ اگر کوئی قوم ان کے مقابل آئیگی۔ تو خاسر و نامراد رہے گی اور یہ قوم فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ فَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ۔ (۳/۱۷۳) نعمائے خداوندی سے جھولیاں بھر بھر کر لاتے گی اور کسی قسم کا شر انہیں چھو تک نہیں سکے گا۔ یہ اس لئے کہ وَ اتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۔ وَ اللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِيْمٍ (۳/۱۷۳)۔ ان لوگوں کی زندگی اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہوگی ۔۔۔ اور جو قوم اقدارِ خداوندی سے ہم آہنگ ہو، اس پر فضیلتوں اور نعمتوں کی بارش ہوتی ہے۔ وَ اَوْرَثَنَا الْاَرْضَ۔ وہی زمین کے وارث قرار پاتے ہیں۔ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ۔ انہیں یہاں بھی جنتی زندگی عطا ہوتی ہے جس میں انہیں ہر طرح کا اقتدار و اختیار حاصل ہوتا ہے اور آخرت میں بھی جنتی زندگی۔ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۳۹/۷۴) تم دیکھو کہ خدا کے پروگرام کے مطابق کام کرنے والوں کی محنت کا اجر کس قدر نعمت بداماں ہوتا ہے؟

یہاں تک ہم نے وسائلِ رزق کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن فکرِ انسان کی رُو سے قائم کردہ معاشی نظام کی اصل دشواری اس سے آگے جا کر سامنے آتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مارکس نے کہا تھا کہ سوشلزم میں اتنا تو تم کر لو گے کہ قوت اور تشدد کے ذریعے، وسائلِ رزق، لوگوں کی ذاتی ملکیت اور قبضہ سے نکال کر اسے مملکت کی تحویل میں دے دو، لیکن اس کا کیا علاج کہ ان وسائل سے رزق حاصل کرنے، یعنی اکتسابِ رزق کی صلاحیتیں مختلف لوگوں میں مختلف ہوں گی، جن میں زیادہ رزق پیدا کرنے کی صلاحیت ہوگی، وہ زیادہ مانگیں گے، تو انہیں زیادہ دینا بھی پڑے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کوئی امیر ہوگا کوئی غریب۔ لہٰذا طبقاتی تفاوت سوشلزم میں ختم نہیں ہو سکے گا۔ یہ تفریق بدستور باقی اور قائم رہے گی، اسی طرح جس طرح یہ کیپیٹل ازم میں باقی اور قائم ہے۔

قارونی ذہنیت

حقیقت یہ ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد ہی صلاحیتوں کے اس فرق پر ہے۔ قرآن کریم نے قارون کو نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ جب اس سے کہا گیا کہ تم اتنا زیادہ سمیٹ کر کیوں رکھے جا رہے ہو، تو اس نے جواب میں کہا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ (۲۸/۷۸)۔ یہ میرے اپنے کسب و ہنر، میری اپنی صلاحیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ اس میں دخل انداز ہو؟ قرآن کریم نے دوسرے مقام پر کہا ہے کہ یہ ذہنیت صرف قارون کی نہیں تھی۔ ہر انسان (جو وحی سے بے نیاز ہو جائے گا) یہی کہے گا۔ بَلْ هِیَ فِتْنَةٌ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹) فتنہ و فساد کی اصل جڑ یہی ذہنیت ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ بات بڑی معقول ہے اور مبنی بر حقیقت۔

اس نقطۂ نگاہ سے دیکھئے تو سوشلزم اور نظامِ سرمایہ داری میں کوئی فرق ہی نہیں رہتا، اس لئے کہ یہ ذہنیت جسے قرآن نے فتنہ کی جڑ قرار دیا ہے، دونوں کی بنیاد میں موجود رہتا ہے، بلکہ جیسا کہ میں ابھی عرض کروں گا سوشلزم نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر قرار پاتا ہے۔ صلاحیتوں کے اختلاف کو دونوں تسلیم کرتے ہیں اور دونوں کے

اُجرتیں مقرر کرنے کا پیمانہ

ہاں یہ بھی مسلّم ہے کہ ہر شخص کو اس کی صلاحیت (یعنی کارکردگی) کے مطابق اُجرت ملنی چاہیئے، لیکن سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس وہ پیمانہ کون سا ہے جس سے آپ یہ ناپ سکیں کہ فلاں نوعیت کی صلاحیت یا کام کی یہ اُجرت ہونی چاہیئے۔ اس کا فیصلہ کون کرے گا اور کس طرح کیا جائے گا کہ (مثلاً) مزدور کی اُجرت یہ ہونی چاہیئے اور انجنیئر کی یہ۔ نظامِ سرمایہ داری ہو یا سوشلزم، یہ فیصلہ بہرحال آجر (یعنی EMPLOYER) ہی کرے گا۔ اسے یہ ملنا چاہیئے اور اُسے وہ ــــ جب کارخانہ کا مالک سیٹھ تھا، تو اس کا فیصلہ وہ کرتا تھا۔ جب اس کارخانہ کو (NATIONALISED) کر کے حکومت اپنی تحویل میں لے لے، تو اس کا فیصلہ برسرِ اقتدار طبقہ کرے گا۔ متاجر (EMPLOYEE) کو دونوں شکلوں میں یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ وہ اپنی اُجرت آپ مقرر کرے۔ یہ جو آپ اس وقت محنت کشوں اور مالکوں میں اس قدر لڑائی جھگڑے دیکھ رہے ہیں، خواہ وہ مالک سیٹھ ہوں اور خواہ حکومت، تو ان کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ مزدور اس معاوضہ سے زیادہ اپنا حق سمجھتا اور طلب کرتا ہے جسے مالک مقرر کرتا ہے اور چونکہ اس حق کے ماپنے کا پیمانہ دونوں میں سے کسی کے پاس نہیں ہوتا، اس لئے اس کا نتیجہ فساد کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔ سوشلسٹ نظام اس فساد کو تشدد کے ذریعے دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن اس میں بُری طرح ناکام رہتا ہے۔ تشدد کے ذریعے کوئی فساد مٹ نہیں سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فساد کچھ وقت کے لئے دب جاتا ہے لیکن جب یہ فساد دبا دیا جاتا ہے، تو اور مصیبت شروع ہو جاتی ہے۔ مزدور جی لگا کر کام نہیں کرتا اور یہ وہ چیز ہے جسے

آپ کسی سے زبردستی کرا ہی نہیں سکتے۔ اس اعتبار سے دیکھئے، تو نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم میں کوئی فرق نہیں ہوتا، لیکن میں نے کہا ہے کہ سوشلزم کا نظام، نظامِ سرمایہ داری سے بھی بدتر نتائج پیدا کرتا ہے۔ وہ اس طرح کہ جب مختلف کارخانے (محنت گاہیں) مختلف مالکوں کے ہوں، تو مزدور کو کم از کم یہ ذہنی اطمینان ضرور حاصل رہتا ہے کہ اس کارخانہ میں حسبِ پسند کام اور اُجرت نہ ملے گی، تو میں کسی دوسری جگہ کام تلاش کر لونگا۔ لیکن سوشلزم میں چونکہ تمام محنت گاہوں کا مالک ایک ہی ہوتا ہے۔ یعنی حکومت، اس لئے مزدور سے یہ ذہنی اطمینان بھی چھن جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے بس قیدی سمجھنے لگ جاتا ہے ــــ غلامی اور آزادی میں یہی بنیادی فرق ہے۔ کام، غلام بھی کرتا ہے اور اپنے کھیت میں ہل چلانے والا کاشتکار بھی، لیکن دونوں کی قلبی کیفیت میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ غلام کی ہر وقت یہ تمنا اور کوشش ہوتی ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ وہ اس جہنم سے نجات حاصل کر لے۔ کاشت کار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اگر زیادہ وقت ملے، تو وہ اور بھی جان مار کر محنت کرے۔ قرآنِ کریم نے اس نفسیاتِ غلامی کو بڑے بلیغ انداز میں واضح کیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون سے کہا کہ میں تمہارے پاس یہ کہنے کے لئے آیا ہوں کہ تم بنی اسرائیل کو اپنی غلامی کی زنجیروں سے رہا کر دو۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو جواب میں کہا کہ ہم نے تم پر اور تمہاری قوم پر یہ احسان کئے اور وہ احسان کئے اور تم ان احسانات کا بدلہ اس طرح دینے کے لئے آئے ہو کہ اس قوم کو میرے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دو!.... اس کے جواب میں حضرت موسیٰؑ نے جو کچھ کہا وہ غلامی اور آزادی کے فرق کو نمایاں طور پر سامنے لے آتا ہے۔ آپ نے کہا کہ وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ أَنْ عَبَّدْتَ بَنِي إِسْرَائِيلَ (۲۶/۲۲) تم جو اپنی نعمتیں گنا رہے ہو، تو کیا اُن کا بدلہ یہ ہے کہ تم نے قوم بنی اسرائیل کو اپنا غلام بنا رکھا ہے؟ اس سے واضح ہے کہ کام کرنے والا جب بھی اپنے آپ کو کام کرنے پر مجبور سمجھے، وہ کبھی جی لگا کر کام نہیں کر سکتا۔ محنت کش جب اپنے آپ کو مجبور سمجھے گا، تو اسے کچھ بھی اُجرت دیجئے، نہ وہ اس پر مطمئن ہوگا، نہ جان مار کر کام کرے گا ــــ اگر محنت کش نظامِ سرمایہ داری میں اپنے آپ کو مجبور پاتا تھا، تو سوشلزم میں مجبور تر سمجھتا ہے اور یہی چیز اس نظام کی ناکامی کی بنیادی وجہ ہے۔ محنت کش سے یہ کہنا کہ جو کچھ ہم تمہیں دیتے ہیں، تمہیں اس پر کام کرنا ہوگا۔ طوعاً نہ کرو گے، تو تم سے کرہاً کام کرایا جائے گا اور تم اُسے چھوڑ کر کہیں اور جا بھی نہیں سکتے کیونکہ رزق کے تمام دروازوں پر ہمارا ہی کنٹرول ہے۔ یہ ایک ایسا جہنم ہے جس کی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔

آیئے ہم دیکھیں کہ قرآنِ کریم اس مشکل ترین مسئلہ کا حل کیا بتاتا ہے! وہی حل جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ یعنی اس حقیقت پر ایمان کہ وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللهِ (۱۶/۵۳) ہر نعمت خدا کی عطا کردہ ہے، میری اپنی نہیں ــــ ہم نے پہلے، ان نعمائے خداوندی میں وسائلِ پیداوار کا ذکر کیا ہے

اب دیکھئے کہ وہ انسانی صلاحیتوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔

انسانی صلاحیتیں بھی منجانب اللہ

قرآن کریم نے جس طرح وسائل پیداوار میں ارض (زمین) کو بنیادی حیثیت دی ہے (اور اس کی حیثیت ہے بھی ایسی) اسی طرح اس نے انسانوں صلاحیتوں میں سمع (سماعت) و بصر (بصارت) اور قلب یا فؤاد (قوتِ فیصلہ) کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ یہ ذرائع (حواسِ خمسہ) معلومات بہم پہنچاتے ہیں اور پھر قلب یا فؤاد، ان سے کسی نتیجہ یا فیصلہ تک پہنچتا ہے۔ ان ذرائع معلومات کے متعلق قرآن کریم نے متعدد مقامات پر کہہ دیا کہ نہ یہ تمہاری پیدا کردہ ہیں، نہ ہی زرخرید، یہ خدا کی طرف سے عطا کی گئی ہیں۔ وَ اللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّہٰتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا۔ تم پیدا ہوتے ہو تو بالکل کورے، علم سے لابلد۔ وَ جَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَۃَ (۱۶/۷۸)۔ خدا نے تمہیں ذرائع معلومات اور قوتِ فیصلہ عطا کی ہے اور انہیں اس نے 'نعمت اللہ' کہہ کر پکارا ہے (۱۶/۸۳)۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا ہے کہ خدا ہی نے تمہیں قوتِ گویائی عطا کی ــــ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ (۵۵/۴) یعنی زبان کے ذریعے اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے کا طریق، نیز تحریر کی صلاحیت۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ (۹۶/۴) اور اس طرح انسان اس قابل ہو گیا کہ جن امور کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا، ان کا علم حاصل کر سکے۔ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۹۶/۵) اس نے صحیح الدماغ ہونے کو بھی خدا کی نعمت قرار دیا ہے۔ جب رسولؐ اللہ کو مخاطب کر کے (مخالفین کے اعتراض کے جواب میں) کہا کہ وَ مَا اَنْتَ بِنِعْمَۃِ رَبِّکَ بِمَجْنُوْنٍ (۶۸/۲) یہ خدا کی نعمت ہے کہ تو پاگل نہیں، صحیح الدماغ ہے ــــ ایک جگہ اس نے وسائلِ پیداوار (ذرائع رزق) اور انسانی صلاحیتوں کے بنیادی ذرائع کا یکجا ذکر کیا ہے، جب کہا کہ قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ ــــ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ (۱۰/۳۱) ان سے پوچھو کہ کون ہے جو زمین اور آسمان سے سامانِ رزق عطا کرتا ہے اور تمہارے ذرائع معلومات پر جس کا بنیادی کنٹرول ہے! ــــ اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ تسلیم کریں گے کہ خدا ہی ایسا کرتا ہے۔ فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ (۱۰/۳۱) یہ ٹھیک ہے کہ اس زمانہ کے مخالفین اس حد تک خدا کو ضرور مانتے تھے، اس لئے ان کی طرف سے یہی جواب ملتا تھا، لیکن آج کے منکرینِ خدا کی طرف سے یہ جواب نہیں ملے گا، لیکن قرآن اس سے بحث نہیں کرتا کہ ان کی طرف سے کیا جواب ملے گا اور اس جواب کی حیثیت کیا ہوگی؟ ان مباحث کی رُو سے وہ انسان کو جس نقطہ تک پہنچانا چاہتا ہے، اس تک ہر جواب پہنچا دے گا اور وہ نقطہ یہ ہے کہ وسائل پیداوار اور انسانی صلاحیتوں کے ذرائع، بہرحال انسان کے اپنے پیدا کردہ نہیں، اس لئے وہ انہیں ذاتی ملکیت قرار نہیں دے سکتا۔ اس حقیقت کو (کہ یہ انسان کے پیدا کردہ نہیں) خدا پرست اور منکرِ خدا

دونوں تسلیم کریں گے۔ معاشرہ ان صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے سامان اور ذرائع بہم پہنچاتا ہے اور فرد اپنی محنت سے ان میں جلا پیدا کرتا ہے، لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر مسلّم رہتی ہے کہ بنیادی طور پر یہ انسان کی یہ اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی اور یہیں سے قرآن آگے بات چلاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ معاشرہ میں مختلف نوعیتوں کے کام ہوتے ہیں جن کے لئے مختلف قسم کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ کسی کے لئے ذہنی صلاحیت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کے لئے جسمانی قوت کی۔ اس حد تک صلاحیتوں میں تفاوت، انسان کی تمدنی ضروریات کا تقاضا ہے۔ وَ رَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (۴۳/۳۲)۔ اختلافِ مدارج سے مقصد یہ ہے کہ کچھ لوگ دوسروں کی زیرِ ہدایات اور زیرِ نگرانی کام کر سکیں، لیکن (وہ کہتا ہے کہ) صلاحیتوں کے تفاوت کو اگر اس بات کے لئے وجہِ جواز قرار دیا اور بطور سند پیش کیا جائے کہ میں اپنی بہتر صلاحیتوں کی وجہ سے جو زیادہ دولت کماتا ہوں، وہ میری ذاتی ملکیت ہے جس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا، تو یہ وہی قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت ہے، جو باطل ہے۔ دیکھئے! قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو کیسے دلنشیں انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَ اللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔ اکتسابِ رزق کے معاملا میں بعض لوگوں کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ اور بہتر صلاحیت حاصل ہوتی ہے۔ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ۔ جن لوگوں کو زیادہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے وہ اس صلاحیت کے ماحصل کو اپنی ملکیت قرار دے لیتے ہیں اور اسے انہیں نہیں دیتے جو ان کی ماتحتی میں کام کر رہے ہوں

صلاحیتوں میں اختلاف

جب ان سے کہا جائے کہ تم ایسا کیوں نہیں کرتے، تو وہ جواب میں کہتے ہیں کہ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ۔ واہ! اس سے تو گھوڑا، گدھا سب برابر ہو جائیں گے۔ میری کمائی میرے لئے، ان کی کمائی ان کے لئے۔ میں اپنی کمائی انہیں کیوں دے دوں؟ اس کے جواب میں قرآن صرف دو لفظ کہتا ہے، وہ یہ کہ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱) ان کی اس ذہنیت کی بنیاد اس مفروضہ پر ہے کہ ان کی صلاحیتیں ان کی اپنی پیدا کردہ ہیں، خدا کی نعمت نہیں ہیں جو انہیں بلا مزد و معاوضہ عطا ہوئی تھیں۔ اس کے بعد قرآنِ کریم ان کے اس مفروضہ اور اس پر مبنی ذہنیت کی تردید، نہایت سادہ اور دل نشین انداز سے روزمرہ کے واقعات کی رُو سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر تمہارے نزدیک اصول یہ ہے ــــ اور یہ اصول بڑا معقول اور غیر متبدل ہے کہ جو جتنا کمائے، اسے اتنا ہی ملنا چاہیئے۔ دوسرے کی کمائی میں اس کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے، تو تم بتاؤ کہ تم اپنے گھر میں اس اصول پر کاربند کیوں نہیں رہتے۔ جو بچہ تمہارے ہاں پیدا ہوتا ہے اس میں کچھ بھی کمانے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد بھی یہ بچے ایک عمر تک کچھ بھی کما کر نہیں لاتے، لیکن اس کے باوجود، تم اپنی کمائی کا بیشتر حصہ

ن پر خرچ کر دیتے ہو، بلکہ ان کی ضروریات اور تقاضے پہلے پورے کرتے ہو۔ تمہارا اصول اگر ایسا ہی محکم اور بے لچک ہے، تو تم یہاں اس پر قائم کیوں نہیں رہتے؟ یہاں تم اس اصول پر عمل کرتے ہو کہ جو شخص کمانے کے قابل ہے وہ پوری پوری محنت سے کمائی کرے اور اس کمائی سے ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملے۔ تم میں اور ہم میں فرق یہ ہے کہ تم صرف اپنے گھر اپنا گھر سمجھتے ہو اور ہم ساری دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں۔ تم صرف اپنے بال بچوں کو اپنا سمجھتے ہو اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا ــــ اس لئے کہ جس خدا پر ہمارا ایمان ہے، وہ خاص خاندان کا خدا نہیں، وہ رَبُّ الْعَالَمِین ہے ــــ اور، یہ پہلا سبق ہے کتاب ہُدیٰ کا ــــ اس کے بعد قرآن، اس قسم کی قارونی ذہنیت رکھنے والوں کے متعلق کہتا ہے کہ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ یَكْفُرُوْنَ (۱۶/۷۲) یہ لوگ باطل پر ایمان رکھتے ہیں اور خدا کی نعمتوں کا کفر برتتے ہیں ــــ یہ ہے قرآنِ مجید کی رُو سے کفر اور ایمان کا عملی مفہوم ــــ میں پوچھتا چاہتا ہوں ان کمیونسٹ عزیزوں سے کہ وہ بتائیں کہ اس ایمان پر انہیں کیا اعتراض ہے؟ کیا یہ وہی ایمان نہیں جس کے فقدان کی وجہ سے مارکس یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ حل تو وہی ہے جسے میں اصولی طور پر پیش کر چکا، لیکن مجھے وہ جذبہ نہیں ملتا جو اس حل کو ممکن العمل بنا دے۔ قرآن وہ حل بھی پیش کرتا ہے اور اسے ممکن العمل بنانے کا طریق بھی بتاتا ہے۔

کفرانِ نعمت

ہم نے اوپر دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم، کفرانِ نعمت کو قارونی (سرمایہ دارانہ) ذہنیت سے تعبیر دیتا ہے اور اسے ایمان کی ضد بتاتا ہے (۱۶/۸۳، ۲۹/۶۷)۔ وہ کہتا ہے کہ کفر ہے جو قوموں کو تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گراتا ہے۔ سورۂ ابراہیمؑ میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ــــ (۱۴/۲۸) کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جنہوں نے کفرانِ نعمت کیا اور اس طرح اپنی قوم کے کارواں کو اس منڈی میں لے گئے جہاں اس جنس کا سد کا کوئی خریدار نہیں تھا۔ اس لئے ان کا سارا سامانِ تجارت تباہ ہو گیا ــــ جَهَنَّمَ یَصْلَوْنَهَا وَ بِئْسَ الْقَرَارُ (۱۴/۲۹) یعنی ان لیڈروں نے اپنی قوم کو جہنم میں دھکیل دیا۔ بُری تھی وہ منزل جس میں انہوں نے اُسے جا اتارا!؟

کفرانِ نعمت کے مقابلہ میں، اس نے شکرِ نعمت، کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کفرانِ نعمت کے معنی ہیں۔ یہ عقیدہ ہے کہ وسائلِ پیداوار (ارض) پر انسان کی ذاتی ملکیت ہو سکتی ہے رزق پیدا کرنے کی صلاحیتیں بھی اس کی اپنی ہیں اس لئے ان کی رُو سے حاصل کردہ دولت بھی صرف اس کی ملکیت ہے۔ اس کے برعکس، شکرِ نعمت کے معنی ہوں گے اس حقیقت پر ایمان کہ وَ مَا بِكُمْ

...ق للّٰہِ (۱۶/۵۳) وسائلِ پیداوار ہوں یا خود میری صلاحیتیں، یہ سب خدا کی عطا فرمودہ ہیں اور
...یہ تحویل میں اس لئے دیا گیا ہے کہ ان سے حاصل کردہ رزق کو میں اسی کے متعین کردہ پروگرام کے مطابق
...ستعمال میں لاؤں اور تقسیم کردوں۔ یہ سب اسی نظام کی رُو سے ہوگا جو قوانینِ خداوندی کے مطابق ان
...کے ہاتھوں قائم ہوگا جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس طرح حاصل کردہ رزق کو قرآنِ کریم نے
...ول و طیب قرار دیا ہے اور اس کو خدا کی عبادت (اطاعت)۔ سورۃ النحل کی اس آیۂ جلیلہ پر غور کیجئے اور

...ق حلال

کانپ اٹھیے۔ اس میں کہا گیا ہے۔ فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا۔ خدا نے تمہیں جو رزق عطا فرمایا ہے، اسے حلال اور طیب طریق سے کھاؤ۔
...شْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (۱۶/۱۱۴) اگر تم اس کے مدعی ہو کہ تم خدا
...سوا کسی کی عبادت (اطاعت) نہیں کرتے (جیسا کہ تم اپنی ہر نماز میں اعتراف و اعلان کرتے ہو کہ اِيَّاكَ
...ُ۔ ہم صرف تیری عبادت (اطاعت) کرتے ہیں)، تو اس طرح شکرِ نعمت کرو اور اس کی وضاحت اس نے
...سے اگلی آیت میں کردی جس میں کہا کہ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ
...نْزِيْرِ وَ مَا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ...... (۱۶/۱۱۵) "تم پر حرام قرار دیا گیا ہے مُردار، خون، لحمِ
...یر اور ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے"۔ اس وقت عزیزانِ من! نہ اس کی
...ت ہے نہ گنجائش کہ میں اس عظیم اور اہم ترین موضوع کی وضاحت کروں (اس کی وضاحت میں نے اپنی
...یں کردی ہے جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا عرض کردینے پر اکتفا کروں گا کہ
...ن کریم کی رُو سے ہر وہ شے حرام ہے جسے غیر اللہ کی طرف منسوب کردیا جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب
...ں رزق کو غیر اللہ کی طرف منسوب ہی نہیں، بلکہ انہیں ان کی ملکیت قرار دیا جائے، تو وہ رزق، رزقِ حلال

...ق اللہ

کیسے قرار پا سکے گا؟ رزقِ حلال تو وہی رزق ہے جسے خدا نے کہیں رزق اللہ کہا ہے (۲/۶۰)۔ کہیں رِزْقِ رَبِّكَ۔ تیرے ربّ کا رزق (۲۰/۱۳۱) اسی کو وہ رِزْقًا حَسَنًا کہہ کر پکارتا
...ے (۱۱/۸۸) اور اس کی وضاحت یہ کہہ کر کردیتا ہے۔ وَ رَزَقَنِیْ مِنْهُ۔ یہ وہ رزق ہے جو کسی انسان سے
...ن بلکہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اسی کو وہ رِزْقٌ كَرِيْمٌ (۲۲/۵۰) سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی "عزت کی روٹی"۔
...قت یہ ہے کہ "عزت کی روٹی" ہوتی وہ ہے جس میں انسان کسی دوسرے انسان کا محتاج اور دستِ نگر نہ ہو۔
...ی انسان روٹی کے لئے دوسرے انسانوں کا محتاج ہوا — خواہ یہ دوسرے انسان وہ ہوں جنہوں نے ذرائع
...ق رزق کو بنیادی طور پر اپنی ملکیت میں لے رکھا ہو، یا انسانوں کا کوئی گروہ جو ان ذرائع پر قابض ہو کر بیٹھ
...ے — تو وہ انسان شرف و مجد انسانیت سے محروم اور ذلیل و خوار ہوگیا۔ یہی وہ غیر اللہ کے ہاتھوں سے ملنے

والا رزق ہے جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو، پرواز میں کوتاہی

انسان تو ایک طرف، جو حیوان اپنے رزق کے لئے انسانوں کا محتاج ہو جائے وہ اپنی جبلّی خصوصیات کھو بیٹھتا ہے۔ جنگل کے شیر اور سرکس کے شیر کا فرق واضح ہے ــــ اور یہ بات صرف اس نظام میں ممکن ہے جو ان انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو جن کا ایمان یہ ہو کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (۱۶/۵۳) یہ وہ لوگ ہوں گے جو جان مار کر محنت کریں گے، زیادہ سے زیادہ کمائیں گے، اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لیں گے اور بقایا دوسرے ضرورت مندوں کے لئے کھلا چھوڑ دیں گے۔ یہ "دوسرے لوگ" بھی اس رزق کو بطورِ خیرات یا احسان نہیں لیں گے، بلکہ اپنا حق سمجھ کر طلب اور وصول کریں گے کہ قرآنِ کریم نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (۷۰/۲۴-۲۵) "ان کے مال میں ضرورتمندوں کا ایسا حق ہے، جس کا سب کو علم ہے"۔ اس نظام کی یہی وہ بنیاد ہے ــــ یعنی یہ ایمان کہ تمام نعمتیں خدا کی طرف سے ہیں۔ جس کے متعلق نبیٔ اکرمؐ کو مخاطب کر کے جماعتِ مومنین کو تاکید کی گئی کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۹۳/۱۱) "اپنے نشوونما دینے والے کی نعمتوں کا عام چرچا کرتے رہا کرو"۔

یہاں سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کس طرح ہوتی اور قائم کیسے رہتی ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور قائم رہتی ہے نظریۂ حیات کے متعلق تبدیلی سے ــــ منکرینِ خدا کی یہی غلط فہمی یہی نہیں ہوتی کہ وہ خدا کی ہستی کے منکر ہوتے ہیں۔ ان کی حقیقی غلط فہمی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کو بس اسی دنیا کی زندگی قرار دیتے ہیں، جس کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس نظریۂ حیات کے بعد، انسان میں کوئی جذبہ محرکہ ایسا نہیں پیدا ہوتا جو اسے اس پر آمادہ کر دے کہ وہ زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس کے ماحصل میں سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دے دے۔ یہ جذبہ اس ایمان سے پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی زندگی صرف طبیعیاتی زندگی نہیں۔ وہ موت کے بعد بھی قائم رہتی اور آگے چلتی ہے۔ انسان صرف اس کے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ جسم کے علاوہ اس میں ایک اور چیز بھی ہے، جسے اس کی ذات کہا جاتا ہے۔ اس زندگی میں انسان کی تگ و دو کا مقصد صرف اپنے جسم کی نشوونما نہیں، اپنی ذات کی نشوونما بھی ہے۔ اس کے جسم کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے وہ اپنے صرف میں لاتا ہے، لیکن اس کی ذات کی نشوونما اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ موت سے انسانی جسم تو باقی نہیں

لیکن اس کی ذات آگے جاتی ہے تاکہ وہ مزید ارتقائی منازل طے کر سکے۔ یہ ایمان درحقیقت خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی صداقت کے یقین پر استوار ہوتا ہے جس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے جو سامنے آکر رہے گا — خواہ اس دنیا میں اور خواہ اس کے بعد — اسے ایمان بالآخرت سے تعبیر

ایمان بالآخرت

کیا جاتا ہے۔ اس ایمان کے بغیر نہ انسان کسی ایثار کے لئے برضا و رغبت تیار ہو سکتا ہے نہ کسی قربانی کے لئے بطیبِ خاطر آمادہ۔ اس عقیدہ سے انسان کے اندر وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے جس سے اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی (۹۲/۱۸)۔ جو کچھ اس کے پاس ہوتا ہے۔ مَا + لَهٗ — وہ اسے دوسرے ضرورت مندوں کے لئے دے دیتا ہے اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ وَ مَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰی (۹۲/۱۹)۔ وہ اسے دوسروں کو اس لئے نہیں دیتا کہ اسے اس کے معاوضہ میں ان سے کچھ ملے گا۔ ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے، جسے وہ اس کے معاوضہ یا صلہ میں دے سکیں۔ نہ ہی ان پر اس کا کوئی احسان ہوتا ہے جس کا بدلہ اتارنے کے لئے اسے کچھ دیں۔ وہ دیتا ہے۔ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰی (۹۲/۲۰) وہ اسے صرف خدا کے متعین کردہ عالمگیر نظامِ ربوبیت کے قیام و استحکام کے لئے دیتا ہے۔ وَ لَسَوْفَ یَرْضٰی (۹۲/۲۱) اس سے اس کی محنت اور کاوش صحیح نتائج سے ہم آہنگ ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہی اس کا بہترین صلہ ہے جس سے اسے حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں وہ نظام متشکل ہوا، اور ہو سکتا ہے جس کا خواب تو مارکس نے دیکھا، لیکن جس خواب کی تعبیر کو ممکن العمل بنانے کے لئے اسے کوئی اساس نہ مل سکی۔ اس نظام میں نہ تو جبر و اکراہ سے وسائلِ پیداوار ان لوگوں سے چھینے جاتے ہیں اور نہ ہی قوت اور تشدد سے انہیں کام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ، اپنا سب کچھ بطیبِ خاطر اس نظام کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس کے بعد، وہ کام جو ان کے سپرد کئے جاتے ہیں، انہیں اپنے قلب و دماغ کی کامل رضامندی سے سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ جبر و اکراہ کا اس نظام میں کوئی کام نہیں ہوتا — اس کی بنیاد لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ (۲/۲۵۶) کے اصولِ محکم پر استوار ہوتی ہے۔ اس ایمان کی حامل جماعت کے سوا دنیا کی کوئی جماعت، کوئی ازم، یا کوئی نظام، نہ اسلامی کہلا سکتا ہے، خواہ اس کا نام کچھ ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے اور نہ ہی اسے اس کا حق حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ذرائع رزق کو زبردستی دوسروں سے چھین لے اور ان کی کمائی پر قابض ہو جائے۔ یہ ملوکیت ہوگی جو استبداد کی رو سے متشکل ہوگی اور تشدد کے بل بوتے پر اسے قائم رکھا جا سکے گا۔ یہی وہ حقیقت بھی جسے اقبالؒ نے سوشلزم کے نظام کو سامنے رکھ کر کہا تھا کہ

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اور تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ سوشلزم نے (جسے محنت کشوں کا نظام کہہ کر دھوکہ دیا جاتا ہے) جہاں جہاں بھی قدم رکھا ہے، ملوکیت کے انہی قدیم حربوں سے کام لیا گیا ہے ــــ قرآن کی پیش کردہ اس حقیقت کو کبھی فراموش نہ کیجئے کہ

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱)

کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک پہلے اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا نہ ہو جائے اسی نفسیاتی تبدیلی کا نام، قرآنِ کریم کی اصطلاح میں ایمان ہے۔ سوشلزم قوم کے خارجی حالات (یعنی اس کی معاشی اور معاشرتی زندگی) میں نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، محض ڈنڈے کے زور پر تبدیلی پیدا کرنا چاہتی ہے جو ناممکن ہے۔ جسے وہ نفسیاتی تبدیلی کہہ کر خود فریبی میں مبتلا ہو جاتی ہے اور دوسروں کو مبتلا رکھنا چاہتی ہے وہ تبدیلی نہیں، محض انسان کے اندر خلا پیدا کرتا ہے ــــ خدا سے بھی انکار، وحی سے بھی انکار، آخرت سے بھی انکار، ہر صداقت سے انکار اور اقرار کسی بات کا بھی نہیں ــــ نفسیاتی تبدیلی کسی مثبت اقرار سے پیدا ہوتی ہے، جسے قرآن اِلّا کہہ کر پکارتا ہے۔ محض انکار سے نہیں جسے وہ لَا سے تعبیر کرتا اور اِلّا تک پہنچنے کے منزلِ اوّل قرار دیتا ہے۔ مارکس کی ناکامی کی یہ بنیادی وجہ تھی۔ اس کے فلسفہ میں لَا ہی لَا تھا۔ اِلّا کہیں نہیں

اور اس کے بعد اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ

ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِأَنْفُسِهِمْ (۸/۵۳)۔

کسی قوم کو اس کی داخلی تبدیلی (ایمان) کی بنا پر جو نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، وہ اس وقت تک باقی رہتی ہیں جب تک ان میں وہ تبدیلی باقی رہتی ہے۔ جب تک وہ تبدیلی باقی نہیں رہتی، اس کی رُو سے حاصل شدہ نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ یہ جواب ہے اس اعتراض کا جو عام طور پر کیا جاتا ہے کہ اسلام اگر صداقت پر مبنی تھا، تو وہ مسلسل قائم کیوں نہ رہا۔ اسلام درحقیقت وہ ذریعہ ہے جس سے قوم اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی کرتی ہے۔ اس ذریعہ سے ایک قوم نے اپنے اندر تبدیلی پیدا کی، تو اسے وہ نعمتیں حاصل ہو گئیں جب وہ تبدیلی پیدا ہوتی رہی، وہ نعمتیں میسر آتی رہیں۔ جب اس نے اس تبدیلی کو پیدا کرنا چھوڑ دیا، وہ نعمتیں ساتھ چھوڑ گئیں۔ اب اگر یہ قوم چاہتی ہے کہ وہ نعمتیں اسے پھر سے حاصل ہو جائیں، تو اُسے پھر سے وہ اپنے اندر پیدا کرنی چاہیئے۔ اسلام میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ جب بھی کوئی قوم اس کے ذریعے اپنے اندر

تبدیلی پیدا کرنا چاہے، وہ تبدیلی پیدا ہو جائے۔ لا تبدیل لکلمت اللہ کے یہی معنی ہیں۔
لیکن مسلمان بھی ہر خدا فراموش قوم کی طرح چاہتا ہے کہ اس تبدیلی کو اپنے اندر پیدا کئے بغیر وہ نعمتیں حاصل کر لے۔ اسی لئے وہ کبھی مغربی جمہوریت کی طرف لپکتا ہے، کبھی سوشلزم کی طرف دوڑتا، لیکن خدا کا قانون یہ ہے کہ نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، خارجی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی قوم کو اس کے بغیر کسی وقت کچھ مل جاتا ہے، تو وہ ایسا ہی ہے جیسے ڈاکو کسی کی متاعِ حیات لوٹ کر مطمئن ہو جائیں کہ ہم خوشحال ہو گئے ہیں۔ ابدی صداقتوں پر ایمان کے بغیر، جو کچھ بھی کوئی حاصل کرے گا وہ ڈاکہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھے گا، خواہ اس کا نام وہ کچھ ہی کیوں نہ رکھ لے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے استعارہ کی زبان میں نہایت دلکش محاکاتی انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سکندرِ اعظم نے ایک بحری قزاق (ڈاکو) سے کہا کہ

صلہ ترا تیری زنجیر یا شمشیر ہے میری
کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دریا کی پہنائی

اس قزاق نے اسے جواب دیا کہ

سکندر! حیف تو اس کو جوانمردی سمجھتا ہے
گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی؟
تیرا پیشہ ہے سفاکی، میرا پیشہ ہے سفاکی!
کہ ہم قزاق ہیں دونوں، تو میدانی میں دریائی

لہذا، مشرق و مغرب کے سرمایہ دار ہوں یا کمیونزم اور سوشلزم کے علمبردار، قرآنِ کریم کی رُو سے دونوں قزاق ہیں کہ دونوں کا پیشہ سفاکی ہے۔
اُس قزاق اور سکندر میں فرق یہ تھا کہ قزاق سے تو سکندر نے بازپرس کر لی، لیکن سکندر مطمئن اور مگن تھا کہ اس سے بازپرس کرنے والا کوئی نہیں کیونکہ اسے اقتدارِ اعلیٰ (SOVEREGNTY) حاصل ہے، لیکن جو نظام اقدارِ خداوندی کے مطابق قائم ہو گا، اس میں کوئی بھی اس بازپرس سے مامون اور مستثنیٰ نہیں ہو گا۔ اس میں ہر ایک کا ایمان یہ ہو گا کہ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيمِ (۱۰۲/۸) مجھ سے ان نعمتوں کے متعلق پوچھا جائیگا کہ تم نے انہیں کیسے حاصل اور صرف کیا تھا۔ اس ایمان کے بغیر کوئی بھی قزاقی سے باز نہیں رہ سکتا۔

*

آخر میں، میں، عزیزانِ من! اس اعتراض کو بھی سامنے لے آنا چاہتا ہوں جو سرمایہ داروں کی طرف سے قرآن کے معاشی نظام کے خلاف عائد کیا جاتا ہے۔ وہ اکثر کہا کرتے ہیں کہ قرآنِ مجید میں بار بار کہا گیا ہے کہ تُوَفّٰی كُلُّ نَفْسٍ

مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۲/۲۸۱) ہر شخص کو اس کی پوری پوری کمائی ملے گی اور کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں ہوگی۔

اعتراض اور اس کا جواب

سوال یہ ہے کہ جو شخص زیادہ کماتا ہے لیکن اسے آپ دیتے ہیں اس کی ضروریات کے مطابق، تو اُسے اس کی پوری پوری کمائی تو نہیں ملتی۔ کیا یہ اس پر ظلم نہیں؟ قبل اس کے کہ اس اعتراض کا جواب دیا جائے، میں ان سے، اور ان کے سوشلزم کے علمبرداروں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ محنت کشوں کو ان کی پوری پوری کمائی کب دیتے ہیں؟ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ آپ کے پاس وہ کون سا پیمانہ ہے جس سے کسی مزدور کی اُجرت ماپی جا سکے۔ آپ مزدور کو وہی دیتے ہیں جو اس سے طے پا جاتا ہے — اور محتاج اور ضرورت مند سے جس طرح معاملہ طے پاتا ہے اس کا کسے علم نہیں؟ باقی رہی سوشلزم، سو اس میں مزدوروں کے ساتھ معاملہ طے پانے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صاحب اقتدار طبقہ جو فیصلہ بھی کرے، اسے انہیں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ کیا اس کو پوری پوری اُجرت دینا کہتے ہیں؟ قرآنی نظام میں ہر کام کرنے والا، بطیب خاطر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اسے یہاں تو اس کی ضروریات کے مطابق دے دیا جائے باقی اگلی زندگی میں ادا کر دیا جائے — اس کی آرزو اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (۲/۲۰۱) اس دنیا کی خوشگواریاں بھی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی۔ وہاں کی خوشگواریوں کے متعلق مختصر ترین الفاظ میں یہ سن لیجئے کہ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (۵۰/۳۵) وہاں یہ چاہیں گے، ملے گا، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔

اگر آخرت کے منکر وہاں کی خوشگواریوں کے وعدہ کو درخورِ اعتنا نہ بھی سمجھیں، تو قرآن کا نظام اس دنیا میں جو اس امر کی ضمانت دیتا ہے کہ ہر ایک کی ضروریات پوری کی جائیں گی، کیا یہ مارکس کے اس خواب کی تعبیر نہیں جسے وہ ناممکن الحصول سمجھتا تھا! فرمائیے — اس پر کیا اعتراض ہے؟

یہ ہے اس مشکل ترین مسئلہ کا وہ حل جو اُمُّ الْكِتَابِ کی طرف سے ملتا ہے۔

والسلام

خطاب طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۵ء

ثریّا عندلیب

ضیائے فکرِ قرآنی

۱) قرآنی نظام کے قیام سے معاشرہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی شخص کسی کا ذرا سا بھی بوجھ نہیں بٹا سکتا۔ ہر ایک کو اپنے کئے کی سزا بھگتنا ہوتی ہے۔ (۶/۱۶۵)

۲) نہ ہی کسی کی سفارش کسی کے لئے وسیلہ بن سکتی ہے، نہ ہی کسی سے اس کے جُرم کے معاوضہ میں کچھ (رشوت) لے کر اُسے چھوڑا جا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی شخص کسی مجرم کا مددگار بن سکتا ہے۔ (۲/۴۸)

۳) یاد رکھو! جو لوگ اپنے اندر ایسی تبدیلی پیدا کر لیں کہ اپنی پیاس بجھانے کے لئے دوسروں کو دھکا دے کر خود آگے نہ بڑھیں، بلکہ اگر دیکھیں کہ ان کی پیاس کی شدّت زیادہ ہے، تو خود پیچھے ہٹ جائیں اور انہیں آگے بڑھ کر پیاس بجھا لینے دیں، تو یہی لوگ ہیں جو فلاح پائیں گے اور ان کی کھیتیاں سرسبز ہوں گی۔ (۵۹/۹)

۴) اصل مقصدِ زندگی "مسابقت فی الخیرات" یعنی انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں میں آگے بڑھنا۔

۵) زندگی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے، اسے یا کفر کے راستے پر چلاؤ یا ایمان کے راستے پر۔

۶) انسانیّت کی زندگی کا تقاضا اور اس کا نصب العین یہ ہے کہ اس کے دو دن بھی یکساں نہ ہوں۔

۷) کامیاب زندگی وہ ہے جو نوعِ انسانی کے لئے باعثِ قیام و دوام ہو۔

۸) کسی انسان کی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ماپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ جب وہ دنیا میں آیا، تو اس نے دنیا کو کیسا پایا اور جب وہ یہاں سے گیا، تو دنیا کو کس حالت میں چھوڑا۔

۹) جتنی زندگی کا دوسرا نام قرآنی نظام ہے۔

۱۰) قوّت کا استعمال شرافت اور عصمت کے تحفظ کے لئے ہونا چاہیئے، جبر و استبداد کے لئے نہیں۔

۱۱) یہ یقین کہ اللہ کا قانون اتنا محکم ہے کہ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، توکّل ہے۔

۱۲) قرآن مومن کی زندگی کا ماحصل فوزالعظیم بتاتا ہے، نجات نہیں۔

۱۳) کسی چیز کے سچے یا غلط ہونے کا معیار اپنا خود ساختہ تصور نہیں ہوتا، معیار تو اس کے نتائج ہوتے ہیں۔

۱۴) منافق تو منافق ہوتا ہے، وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک ذہنیت کا نام ہے۔ ایسی ذہنیت جیسے بھڑ کی ہوتی ہے کہ وہ ہر جگہ ڈنک مارتی ہے۔

۱۵) کائنات کی ہر شے جدّوجُہد میں مصروف ہے۔ ان کی اس تسبیح (جدّوجُہد) کا نتیجہ کائنات کا حُسن ہے۔

۱۶) کائنات کے ربط باہمی کا یہ عالم ہے کہ ایک انگلی کی جنبش کا اثر ثریّا تک جا کے پڑتا ہے۔

۱۷) سارے قرآن میں ایمان کے لئے صیغۂ فعل (VERB) کا استعمال ہوا ہے، یعنی یہ کچھ کرنے کی بات ہے، کہنے کی نہیں۔

۱۸) انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ خداوندی کا کرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جس قدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا، اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی چلی جائیگی۔

۱۹) مومن مَردوں اور عورتوں کی پیشانیوں کا نُور ان کے آگے آگے دائیں بائیں چلتا ہے تاکہ ان کی زندگی کی تمام راہیں جگمگاتی رہیں۔

۲۰) تربیّت و استحکام ذات کا نام جنّت کی زندگی ہے اور اسے فراموش کر دینا جہنّم ہے۔ یہ جنّت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے۔ جب قرآن انسان کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جائے (یعنی انسان اقدارِ قرآنی کا حامل ہو جائے)۔

۲۱) رشتہ داری کی بندھنیں یا ماحول کے اثرات انسان کے ایمان کے راستے میں روک بن کر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ انسان کو اتنی زبردست قوتِ ارادی دی گئی ہے کہ یہ ان تمام موانعات اور مؤثرات پر قابو پا سکتا ہے۔ اسی لئے خدا نے ابلیس سے کہا تھا کہ میرے بندوں پر تیرا غلبہ نہیں ہو سکے گا۔ (۱۵/۴۰ ، ۱۲/۶۵)

۲۲) دین کا مقصد یہ تھا کہ معاشرہ میں جو شخص بے یار و مددگار رہ جائے، اُسے محسوس تک نہ ہونے پائے کہ وہ تنہا اور بے کس ہے اور اگر کسی وجہ سے کسی کی کوئی ضرورت رُک جائے، تو اُسے فوراً پورا کر دیا جائے۔

۲۳) جو فرد یا قوم کشمکشِ حیات میں تعمیری پہلوؤں کو غالب رکھتی ہے، وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو اس کے خلاف چلتی ہے، اس کی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی صلاحیتیں سلب ہو جاتی اور آخرالامر اس پر موت طاری ہو جاتی ہے۔

۲۴) جس چیز کو ہمارا نفس عام طور پر عقیدت و عظمت کے خوش آئند لباس میں پیش کرتا ہے وہ اکثر اوقات اپنی دوں ہمتی اور سہل انگاری کی پردہ پوشی ہوتی ہے ورنہ ایک مسلم کی زندگی ذہنی، قلبی اور بدنی ہر حیثیت سے سرتاپا سعی و عمل کی زندگی ہے، تگ و دَو کی زندگی ہے، یکسر جہاد کی زندگی ہے، عقل و بصیرت اور غور و

تفکر کی زندگی ہے، جمود و تعطل کی زندگی نہیں اور ان دونوں زندگیوں کو قرآنِ کریم نے برابر قرار نہیں دیا۔ (۱۳/۱۹)

(۲۵) شیطان کے ایک لفظ کے اندر انسان کے تمام پست، مکروہ اور تباہ کُن جذبات آجاتے ہیں۔

(۲۶) قرآن کی رُو سے دو ہی پارٹیاں ہیں، حزب اللہ اور حزب الشیطان۔ ان کے اندر مختلف پارٹیاں بنانا شرک ہے جس کا نتیجہ عذابِ الیم ہے۔

(۲۷) معاشیات کا اصول (۵۹/۷) دولت صرف اوپر کے طبقے میں ہی گردش نہ کرتی رہے، بلکہ اسے سارے معاشرہ میں گردش کرتے رہنا چاہیئے جس طرح خون پورے جسم میں گردش کرتا ہے۔

(۲۸) ہر روشن چیز اپنے روشن وجود کی خود دلیل ہوتی ہے۔

(۲۹) خالق، باری، مصوّر، قرآن نے پورے سلسلۂ ارتقار کو ان تینوں لفظوں میں، جس ایجاز و اختصار سے سمٹا کر رکھ دیا ہے، بڑے بڑے سائنسدان بھی نہ اس میں اضافہ کر سکتے ہیں نہ کمی کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی ترتیب بدل سکتے ہیں۔ اگر ہم اس پر تفکر و تدبّر کرتے، تو انفس و آفاق کی نشانیوں کو سمجھ سکتے تھے۔

(۳۰) اسلام کے نام سے ساری دنیا میں ہم جو سرنگوں پھر رہے ہیں، تو یہ خدا کے دینِ اسلام کی وجہ سے نہیں، بلکہ یہ مذہب ہے جس کے ہاتھوں ہمارا یہ حشر ہو رہا ہے اور اس روش کے ساتھ قیامت تک یہی ہوتا رہے گا۔ یہ قرآن کا اعلان ہے۔

(۳۱) جہاد کی تیاری تلوار تیز کرنا نہیں، نظام کے استحکام کے لئے سلسلِ کوشش ہے۔

(۳۲) خدا اپنے پروگرام کی تکمیل کے لئے انسان کی استعانت چاہتا ہے۔ (سورۂ صف کی آخری آیات)

(۳۳) قرآن نہایت واضح و مبین کتاب ہے لیکن جہاں اس سے رہنمائی حاصل ہی نہ کی جائے، تو اس کا حکم ہونا بے معنی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ صرف "تلاوت" کے لئے رہ جاتی ہے۔

(۳۴) جس قوم میں انسان کی تکریم بہ حیثیت انسان نہ ہوتی ہو، بلکہ تذلیل ہوتی ہو، سمجھ لیجئے کہ وہ معاشرہ جہنم میں ہے۔

(۳۵) ہمارے ہاں حق ایک ذہنی سی چیز ہے جسے عمل سے کوئی واسطہ نہیں۔ لسانِ عربی میں حق کے معنی ہوتے ہیں، وہ نتیجہ جو محسوس شکل میں سامنے آجائے، یہ نظری بحث نہیں ہے۔

(۳۶) غلط روش کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ قرآن نے اس کی مثال پہاڑ کی چوٹی سے گرنے کی دی ہے کہ وہاں سے آدمی ایک دفعہ پھسلتا ہے اور پھر اپنے زور دروں سے ہی نیچے گرتا چلا جاتا ہے۔

(۳۷) سارے شہر میں جائیے، کسی مسجد کے باہر آپ کو اللہ کی مسجد لکھا نظر نہیں آئے گا۔ مسجدیں ہیں مسجد غوثیہ، مسجد حنفیہ، مسجد رضویہ وغیرہ وغیرہ۔ شرک میں یہی تو موج ہوتی ہے۔ ہزاروں خدا بن جاتے ہیں۔

۳۸) جس نے قرآن کی رُو سے فراست حاصل کی ہو، اسے بہت دور کی چیز قریب نظر آجاتی ہے۔ خدا کی روشنی سے دیکھنا، قرآن کی روشنی سے دیکھنا ہے۔

۳۹) نماز کے اجتماعات ضروری ہیں مگر ان کا نتیجہ وہی ہونا چاہیئے جو سورۂ ماعون میں بتایا گیا ہے۔

۴۰) ساری سازش ہزار سال کی ملوکیت میں یہ تھی کہ قرآن کے انقلابی پروگرام کی طرف عوام کی نگاہ نہ اُٹھنے پائے۔

۴۱) اگر انسان کے اعمال پر اللہ تعالیٰ فوری گرفت کرلے، تو دنیا میں کوئی انسان باقی ہی نہ رہے۔ اس لئے خدا نے مہلت کا وقفہ رکھا ہے تاکہ انسان اس اصلاح کے موقع سے فائدہ اٹھالے۔

۴۲) قرآن سے قانون سازی کا یہ طریقہ ہے کہ اس نے جو اصول دیئے ہیں، ان سے نتائج مرتب کرکے قانون بنایا جائے۔

۴۳) ایک ہی بات جہنم سے الگ ہونے کا معیار ہے کہ جو بات کہی جائے، اسے غور سے سُنا جائے اور پھر عقل و فکر سے کام لے کر اس پر عمل کیا جائے۔

۴۴) جو لوگ اپنی دیکھنے، سننے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے کام نہیں لیتے، یہی ہیں وہ جو اپنے آپ کو جہنم کے لئے تیار کر رہے ہیں۔ (۷/۱۷۹)

۴۵) قرآن نے انسان کو قلم کے ذریعے سکھلایا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تحریر کے ذریعے اپنا مفہوم بیان کرنے کی صلاحیت انسان کو عطا ہوئی۔

۴۶) عمل کا نتیجہ ہمیشہ اس کے بعد مرتب ہوتا ہے۔ اسی لئے خدا نے اس کے لئے عاقبت کا لفظ استعمال کیا ہے اور یہ صرف قیامت سے وابستہ نہیں کیونکہ ہر کرنے والا سانس کل سے تعلق رکھتا ہے۔

۴۷) جس حُسن و خوبی سے یہ خارجی کائنات قوانینِ قدرت کے تحت چل رہی ہے، وہی حُسن و خوبی انسانی معاشرہ میں ہونی چاہیئے۔

۴۸) جو محنت کرنے کے قابل ہے لیکن محنت نہیں کرتا، اس کی ذمہ داری اٹھا لینا قرآن کے اس اصول کے خلاف ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔

۴۹) عمل کی حد تک خود اعتمادی اور نتیجے کی حد تک خدا اعتمادی، ایک مومن کی زندگی ہے۔

۵۰) انسان کی طبیعی زندگی کا انحصار سانس لینے پر ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم نے ایک بار سانس لیا یا کبھی کبھی سانس لے لیا، تو اس سے زندگی برقرار رہے گی۔ یہ تو زندگی بھر کا عمل پیہم اور شعار مسلسل ہے۔ جونہی اس سے انقطاع ہوا، زندگی ختم ہوگئی۔ طبیعی زندگی کی طرح انسان کی انسانی زندگی کی بھی یہ کیفیت ہے۔ یہ حیات آور شعار ایسا نہیں کہ اسے جب جی چاہا اختیار کرلیا اور جب جی چاہا چھوڑ دیا۔

تو مسلسل اختیار کئے رکھنا ہوگا۔ اس کے لئے استقامت شرط ہے (۴۱/۳۰، ۴۶/۱۳)۔ دعوائے ایمان کے بعد استقامت بنیادی شرط ہے۔ یہ ہے

فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ

ساری عمر مُسلم رہنے سے مراد ہے کہ اسلام عمر بھر کا پروگرام ہے۔

محمد لطیف چوہدری

یہ ہمارا خواب تھا

(قائداعظمؒ کے پاکستان کا نقشہ، خود قائداعظمؒ کے الفاظ میں)

پاکستان

- ایک ایسی مملکت جس میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود قرآن کی رُو سے متعیّن ہوں گے۔
- جس میں ہم آزاد انسانوں کی طرح رہ سکیں گے۔
- جس میں کوئی قانون ایسا نہ ہوگا جو قرآن کے خلاف ہو۔
- جس میں تھیاکریسی یعنی مذہبی پیشواؤں کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔
- جس میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے گا۔
- جس میں سرمایہ داری اور زمینداری جیسے غیر اسلامی نظام ختم ہو جائیں گے۔
- جس میں نہ مغرب کی بے لگام جمہوریت راہ پا سکے گی نہ روس کی اشتراکیت۔
- جس میں اسلام کے عدلِ عمرانی کے اصول نافذ ہوں گے۔

یہ تھا ہمارا خواب ۔ اب اس خواب کی تعبیر دیکھئے
مگر دیکھنے کے لئے آپ کو جگر تھام کر بیٹھنا ہوگا۔

یہ خواب کی تعبیر ہے

تصویر ایک دن کی

بدھ 24 صفر 1412ھ 4 ستمبر 1991ء

لاہور میں ایک ماہ کے دوران ۲۱ قتل ۳۸ ڈکیتیاں

207 چوریاں ہوئیں' 65 کاریں اور موٹر سائیکل چرائے گئے' 13 افراد کو تاوان کیلئے اغوا کیا گیا

ڈاکوؤں کے ہاتھوں 19 افراد زخمی ہوئے پولیس نے 7 شہریوں پر تشدد کیا

دو چہیتے "اپنے" سے 14 عورتیں جاں بحق ہوئیں' 40 لاکھ کے زیورات اور نقدی لوٹی گئی

گکھڑ منڈی میں ڈاکوؤں اور گاؤں والوں کا مقابلہ' دو سگے بھائی جاں بحق

کوآپریٹو اداروں نے ایک ہزار اہم شخصیات کو 8 ارب کے قرضے جاری کئے

گلبرگ مین بلیوارڈ سے غیر ملکی شراب کی 456 بوتلیں پکڑی گئیں

پانچ بھیڑیئے اور اکیلی عورت ..... کمینو میرا قصور کیا تھا' قتل کر دیتے عزت تو نہ لوٹتے

ساتویں جماعت کی 14 سالہ طالبہ کا اغواء ملزمان 15 روز تک مسلسل زیادتی کرتے رہے

جھنگ میں نامعلوم افراد نے بم مار کر ایک شخص کو ہلاک اور 5 کو زخمی کر دیا

بوجھو تو جانیں! سالانہ تنخواہ ایک لاکھ 20 ہزار!! 20 لاکھ کی مرسیڈیز' 80 لاکھ کی کوٹھی کہاں سے آئی

مینٹل ہسپتال کے ننگے مریض

4 ستمبر 1991ء

چینی کی قیمت میں ۵۰ روپے فی بوری اضافہ ہو گیا

کسی خاص فرقے کی تعبیر پر مبنی شریعت بل قبول نہیں کریں گے' ساجد نقوی

پٹائی کیلئے بی کس تین ملازم

ڈاکوؤں نے لیڈی ولنگڈن ہسپتال کے سابق ایم ایس کا گھر لوٹ لیا

کراچی میں بم کا خوفناک دھماکہ' 2 افراد ہلاک

سینکڑوں افراد کی موجودگی میں اسلحہ دکھا کر نئی کار چھین لی

ٹاؤن شپ میں نقب زنی۔ پانچ لاکھ کا مال اڑا لیا

بدھ 4 ستمبر 91ء ملتان کے قریب 25 مسلح افراد کا حاملہ عورت سے انسانیت سوز سلوک

ملک حنیف وجدانی

سیاسی پارٹیاں اور اسلام

(بسلسلہ وفاقی شرعی عدالت میں زیرِ سماعت سوالات)

سوال ۱۴:۔ عالمِ امر اور عالمِ خلق میں کیا فرق ہے۔
اور یہ عالمِ خلق سے متعلق اللہ تعالیٰ کی ذاتِ ارفع و اعلیٰ سے منسوب قرآن کی ذمہ داریاں و کردار کس طرح علمی صورت اختیار کرتی ہیں۔ اس سلسلہ میں "سنت اللہ" کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت اور وحیٔ خداوندی کے مطابق قائم نظامِ تمدن (حکومتِ الٰہیہ) کی کیا پوزیشن و کردار ہے؟

جواب:۔ مشہور مفکر جناب محمود شبستری نے ۹ سوالات کئے تھے، جن کے جوابات نہ دیئے جا سکے۔ علامہ اقبالؒ نے "گلشنِ راز جدید" میں ان ۹ سوالات کے جوابات دیئے، جو واقعی ایک مفکر کا دوسرے مفکر کے حضور بہترین جوابی تحفہ ہے۔

جناب عبدالرزاق عادل صاحب کا پیش کردہ سوال ۱۴ کچھ ایسا ہی انداز و مقام رکھتا ہے۔ بہرحال میں عصرِ حاضر کے اس مشکل، بلکہ پیچیدہ ترین سوال کا جواب دینے کی کوشش کا (انشاء اللہ) آغاز کرتا ہوں۔

عالمِ امر اور عالمِ خلق کا فرق سامنے لانے سے پہلے اس بارے میں عربی اور انگریزی زبان کا ایک معجزنما فرق ملاحظہ ہو۔

"مشہور مفکر (PRINGLE PATTISON) کہتا ہے کہ یہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے جس میں تخلیق کے لئے صرف ایک لفظ (CREATION) ہے، حالانکہ محسوس کائنات کی تخلیق اور غیر مرئی و غیر محسوس کی تخلیق میں جو اہم فرق ہے، اس کے اظہار کے لئے دو الگ الگ الفاظ ہوتے۔ قرآن نے اس کے لئے خلق اور امر، الگ الگ الفاظ استعمال کئے ہیں۔" (لغات القرآن، از علامہ غلام احمد پرویزؒ)
"مادہ، ام" (ص ۲۵۸)

ب اور حوالہ ملاحظہ ہو۔

"یہ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علّت اور معلول (CAUSE AND EFFECT) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔ جب ہم اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لے جائیں، تو ایک مقام ضرور ایسا آئے گا، جہاں یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا اور وہاں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک معلول (EFFECT) بغیر کسی سابقہ علّت (CAUSE) کے ظہور میں آگیا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے تمام کائنات کا سلسلہ خدا کی مرضی، منشا، اور پوری خود مختاری سے شروع ہوتا ہے۔" (ایضاً ص ۹۸۹)

آن کریم میں ہے کہ اللہ ج

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲/۱۱۷) ہے۔

زمین اور آسمانوں کو عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے۔

وَ لِلّٰهِ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۱۱/۱۲۳، ۳۵/۳۸، ۳۵/۴۱)۔

زمین اور آسمانوں کے تمام سربستہ راز اللہ ہی کے لئے ہیں۔

بس یع" اور "غیب" عالمِ امر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب وہ اپنے امر سے جس شے کی تخلیق کرنا چاہے، تو تخلیق ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۳۶/۸۲)۔

امر تمام آسمانوں میں جاری ہو گیا۔

وَ اَوْحٰى فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا (۴۱/۱۲، ۳۰/۲۵)۔

ب یہ امرِ تخلیق زمین کی طرف آگیا۔

یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (۳۲/۵، ۶۵/۱۲، ۳/۲۵)

امر سے عالمِ خلق تشکیل پا گیا۔ اب ہم عالمِ خلق کی بات کرتے ہیں۔

اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ (۲۷/۶۰)۔

کس نے آسمانوں اور زمین کو تخلیق کیا۔

ل کا جواب یہ ہے کہ

خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ بِالْحَقِّ (۲۹/۴۴)۔

اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ تخلیق کیا۔

اب آسمانوں اور زمین کے ساتھ سورج، چاند، ستارے، سیارے تخلیق پا گئے۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یُغْشِی الَّیْلَ النَّهَارَ یَطْلُبُهٗ حَثِیْثًا وَّالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ وَ النُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ۔

(۷/۵۴، ۱۶/۱۲)

بے شک تمہارے ربّ نے آسمانوں اور زمین کو چھ ادوار میں تخلیق کیا۔ پھر اس نے اپنا اقتدار متمکن کیا۔ وہ دن کو رات کے پردے میں ڈھانپ دیتا ہے۔ سورج، چاند اور ستارے تخلیق کئے، جو اس کے تخلیقی امر میں اسیر ہیں۔ اب کرۂ ارض تخلیقات سے جگمگا اٹھا۔

وَ اللّٰهُ خَلَقَ كُلَّ دَآبَّةٍ مِّنْ مَّآءٍ فَمِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی بَطْنِهٖ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰی رِجْلَیْنِ ۚ وَ مِنْهُمْ مَّنْ یَّمْشِیْ عَلٰۤی اَرْبَعٍ ؕ یَخْلُقُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (۲۴/۴۵، ۶۵/۳)۔

اللہ نے ہر جاندار کی ابتدا پانی سے کی۔ ان میں وہ بھی ہیں جو پیٹ کے بل چلتے ہیں۔ وہ بھی ہیں جو دو پاؤں پر چلتے ہیں اور وہ بھی ہیں جو چار پاؤں پر چلتے ہیں۔ اللہ جو چاہے تخلیق کرتا ہے۔ بے شک اللہ ہی ان تمام ذی حیات کو ان کی زندگی کی اقدار دینے پر قادر ہے۔

سوال ۱۴ کے پہلے حصہ کا جواب مکمل ہو گیا ہے۔ اس میں عالمِ امر کے فیصلوں کے خاکہ کے مطابق عالمِ خلق تشکیل پایا۔ سَمٰوٰت، اَرْض، بَیْنَهُمَا، سورج، چاند اور ستارے تخلیق پا گئے۔ زمین پر پانی کے جاندار اور خشکی کے جاندار معرضِ وجود میں آ گئے، پیٹ کے بل چلنے والے، دو پاؤں پر چلنے والے، چار پاؤں پر چلنے وا وغیرہ وغیرہ۔

کائنات میں کارفرما قوانینِ فطرت کی پابند مخلوق اور فطرت کی پوشیدہ قوتیں (ملائکہ) پوری سرگرمی سے اطاعت پذیر ہیں، کسی کو مجالِ سرتابی نہیں۔ کوئی بھی ان قوانین سے آزاد نہیں کہ ان کی خلاف ورزی کر سکے زندگی اپنے جوبن پر ہے، لیکن یہ تمام زندگی پابندِ فطرت ہے۔ اب "عالمِ امر" کے مطابق "عالمِ خلق" میں ایک نئے باب کا اضافہ ہونے والا ہے۔ اب اس مخلوق کی جانشینی کا تاج اُس کو پہنایا جائے گا "جو اِنْ" سے مختلف

ہوگا، جو پابندِ فطرت نہیں ہوگا۔ وہ آزادِ فطرت ہوگا۔ ان حالات میں "اللہ" نے "انسان" کی تخلیق کا پروگرام طے کرلیا۔ اس سے پہلے "انسان" نام کی کوئی قابلِ ذکر مخلوق نہ تھی۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا (۷۶/۱، ۱۹/۶۷)۔

اس آیۂ کریمہ میں "عَلَى الْاِنْسَانِ"، "مِنَ الدَّهْرِ" اور "شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا" انتہائی قابلِ غور ہیں نیز یہ بھی معلوم رہے کہ اس سورہ کا نام ہی "الدَّهْرِ" ہے۔ انسان اور زمانہ اس میں ساتھ ساتھ نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ نوعِ انسانی اور زمانہ ایک ساتھ اب ہوں گے۔

انسان کوئی قابلِ ذکر شے نہ تھا۔ دو پاؤں اور چار پاؤں والے چھائے ہوئے تھے۔

ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ (۲۳/۱۴۔ ۲۳/۳۱ بطور مثال) (۲۳/۴۲)۔

اللہ نے اس سابقہ موجود مخلوق سے ایک نئی مخلوق "خَلْقًا اٰخَرَ"، "اَنْشَاء" کی اور یوں

صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ (۳۰/۶۴، ۴۰/۶۸، ۸۳/۷)۔

وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ (۷/۱۱)۔

فَخَلَقَ فَسَوّٰى (۷۵/۳۸، ۸۷/۲) سے تخلیقِ نو ہوئی۔

ان آیات میں اَنْشَاْ (۲۱/۱۱)، صَوَّر، سَوّٰی کے الفاظ قابلِ غور و فکر ہیں۔ کائنات کی اس تخلیقی لیبارٹری میں سابقہ موجود مخلوق کی تہذیب سے ایک نئی مخلوق پیدا کردی گئی، جو "انسان" کہلائی۔ اس نئی مخلوق کو آزادِ فطرت پیدائش کی راہ پر ڈالا گیا اور اُس کو انا۔ اَ۔ میں روح، خودی، انسانی ذات عطا کردی گئی جو امرِ الٰہی سے ہوئی۔

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ (۳۲/۹)۔

وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (۳۸/۷۲)۔

اس اہم ترین اعزازِ ذات کے ساتھ "انسان" کرۂ ارض پر سابقہ مخلوق کا جانشین بنا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ (۹۵/۴)۔

یوں انسان اپنی ہیئتِ ترکیبی کے لحاظ سے احسنِ تقویم کے درجہ پر پہنچا۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

نعرۂ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحبِ نظرے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہان مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شُد

خبرے رفت زِ گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

(کلیاتِ اقبال فارسی صفحہ ۲۵۵)

" خاکِ جہانِ مجبور" سے " خودنگرے " انسان پیدا کیا گیا، یہ ازخود پیدا نہیں ہوا۔ یہ صرف مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ اللہ کا ایک عظیم پروگرام تخلیق ہے۔ اب جہان ارض و سمٰوٰت میں ایک " اللہؐ " ہے اور ایک " انسان " جو اپنی اپنی " انا " رکھتے ہیں۔ انسان کی " انا " اللہ کی عطا کردہ ہے۔ یہ سب اس کی بخشش اور رحمت و مروت ہے۔ علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

ے کہ ایں جا ہیچ کس جز ما و او نیست

اب یہ عظیم قوتِ اختیار و ارادہ (انا، أ، میں، روح، خودی، نفس، انسانی ذات) خود انسانی دنیا میں بحث مباحثہ کا مرکز بننے لگی۔ بَلْ قَالُوْا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُوْنَ (۲۳/۸۱)۔ یعنی

وَ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ وَ مَاۤ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا (۱۷/۸۵)

یہاں اس عظیم قوت کو " اَمْرِ رَبِّیْ " کہا گیا ہے۔

اب انسانی دنیا میں " امرِ ربی " ہی وہ مرکز بنے گا جس سے انسانی معاشرہ اپنے عروج و زوال اور تہذیب کے بلند و پست معیار کے لئے جانچنے کا واحد پیمانہ ہوگا۔ اس کے لئے اللہ نے انسانی آبادی میں رسول بھیج کر ان کو وہ پیغام دیا جس کے بغیر یہ نئی مخلوق گمراہ اور ناواقف رہ سکتی تھی۔ یہ وہی ہدایت تھی جو سابقہ مخلوق کو پابندِ فطرت ہونے میں خود بخود مل جاتی تھی۔ اب انسانی عقل کو استعمال کیا جائے گا کہ انسان کو سمع، بصر، فواد اور غور و فکر کی قوت عطا کردی گئی۔ (۳۲/۹)۔

ے تقدیر کے پابند نباتات و جمادات
مومن فقط احکامِ الٰہی کا ہے پابند (اقبالؒ)

بلکہ یہ اعزاز انسان کو اس سے کہیں آگے لے جاتا ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (اقبالؒ)

اب ہم انسانی دنیا میں عالمِ امر، وحی اور سنت اللہ یعنی قوانینِ کائنات سے تطابق اور انسانی تمدن میں "خودی کو کر بلند اتنا" اور "تیری رضا" کا جائزہ (انشاء اللہ) لیتے ہیں۔

(۱) انسان کو انسانی ذات (انا، خودی، روح) امرِ ربی سے ملی۔

(۲) انسان کو وہ احساسِ لطیف (وجدان) دیا گیا جس سے وہ اشاراتِ وحی کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کر سکے۔ یہ احساسِ لطیف ان منتخب ہستیوں (انبیاء کرام علیہم السلام) کو بہت زیادہ دیا گیا۔ قرآن میں اس کے لئے "عَلٰی قَلْبِكَ" کے الفاظ آئے ہیں۔ وحی ان کو کیسے ملنے لگی اور آخر تک کیسے ملتی رہی۔ اس کی کیفیت کیا ہوتی تھی۔ یہ کوئی غیر از نبی نہیں سمجھ سکتا۔ ہم اس طریقِ وحی پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ اس کی جزئیات اور طریقِ کار پر بحث کرنا کبھی بھی تقاضائے ایمان سے ٹکرانا نہیں چاہیئے۔

يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ (۴۰/۱۵)۔

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے وحی کر دیتا ہے۔

یوں انسانی دنیا میں تمدن و معاشرت کے اندر آزاد مرکزیت کی ابتداء ہوئی۔ "اجتماعی زندگی کا وحی کے مطابق آغاز ہو گیا۔

(۳) وحی کا سلسلہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی صورت میں جاری ہو گیا۔ قرآنِ کریم میں جن حضرات انبیائے علیہم السلام کا تفصیلی تذکرہ ہے۔ ان میں سے کچھ اسمائے گرامی یوں ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت شیثؑ، حضرت ادریسؑ، حضرت الیاسؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت اسماعیلؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت یوسفؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت ہارونؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت یونسؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت عیسیٰؑ اور آخر میں حضور نبیٔ اکرم جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی آتا ہے۔

نکتۂ بازگشت ہم سابقہ تشریحات کا بارِ دگر اعادہ کرتے ہیں کہ بات واضح ہو جائے۔

۱۔ انسانی ذات، خودی، روح، امرِ ربی سے ملی۔
۲۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کی طرف وحی امرِ ربی سے ہوئی۔
۳۔ حضرات انبیائے کرام کا سلسلہ امرِ ربی سے جاری رہا۔
۴۔ ختمِ نبوت، امرِ ربی سے وقوع پذیر ہوئی۔

اب ہم کائناتی قوانینِ خداوندی اور انسانی معاشرہ میں انسانی ذات کا امرِ ربّی نیز سابقہ کتبِ آسمانی اور آخری کتاب قرآنِ کریم کے امرِ ربّی کا بطور تمدن انسانی جائزہ لیتے ہیں۔

پانی کی تسخیر

دیگر ارضی مخلوق کی طرح انسان بھی پانی سے استفادہ کرتا تھا لیکن دریا اور سمندر اس کی راہ میں حائل تھے۔ اس کی تسخیر کا قانون کائنات (حجم، وزن) موجود تھا، لیکن انسان اس سے ناواقف تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام کے دورِ تسخیرِ آب میں انسان کو کشتی بنانے کا فن اللہ نے خود سکھایا۔ چنانچہ اس بارے میں قرآنِ کریم میں ہے:۔

وَ اصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَ وَحْيِنَا (۱۱/۳۷)

ہماری آنکھوں کے سامنے وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔

یوں کائناتی قوانینِ خداوندی (وزن۔ حجم) انسان کو بذریعہ وحی بتلائے گئے اور امرِ ربّی والے رسول حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی بنا کر انسانی دنیا میں امرِ الٰہی کے مطابق تحفظ حاصل کیا، وہاں نوعِ انسانی میں تسخیرِ آب کا پہلا مرحلہ شروع ہو گیا، جو آج تک کائناتی قوانین کے مطابق مسلم معاشرے اور غیر مسلم معاشرے میں جاری و ساری ہے۔

بلکہ یوں کہنا بجا ہو گا، غیر مسلم معاشرے نے عقلِ انسانی سے کام لے کر مسلمانوں سے کہیں زیادہ اس فن کو ترقی دی ہے، یہ نوعِ انسانی کا ایک قیمتی اثاثہ ہے، بشرطیکہ اسے امن کے لئے استعمال کیا جائے۔

یوں کائناتی قوانینِ خداوندی کے مطابق انسانی معاشرے میں "امرِ ربّی" بذریعہ رسول تسخیرِ آب کا باعث بن گیا۔

تسخیرِ حیوانات

قُلْنَا احْمِلْ فِيهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (۱۱/۴۰)۔

یوں حضرت نوح علیہ السلام نے تمام جانوروں سے دو دو جوڑے کشتی میں چڑھا دئے، جس سے ان کی آئندہ نسل چلی اور انسانوں نے ان کو پالنے، سدھانے اور تصرف میں لانے کے انداز سیکھے۔ اس طرح انسانوں نے حیوانات کو مسخر کر کے ان سے فوائد حاصل کرنے کا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے جانوروں کی کھال بطور لباس استعمال کی گئی۔ پھر ان کے بالوں اصواف، بھیڑ کے بال، ادیار، اونٹ کے اشعار، بکری کے بال سے کمبل، خیمے اور لباس وغیرہ بنائے۔ جانوروں کا دودھ پہلے ہی زیرِ استعمال تھا۔ دودھیلے جانوروں کی نسل کو ترقی دی گئی جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔

سواری کے لئے گدھے، گھوڑے، خچر اور اونٹ کو سدھایا گیا۔ اونٹوں کے قافلے سوداگری کرنے لگے تو گھوڑوں کے رسالے لڑائی میں استعمال کئے جانے لگے۔ بحری امیر اور غریب ہر دو کا قیمتی اثاثہ تھا۔ انہی ایام

ں کتے کو سدھا کر رکھوالا بنا لیا گیا۔ یوں انسان نے ارضی مخلوق پر تصرف حاصل کر لیا۔

صات کا زمانہ | قرآنِ کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے تذکرہ میں ہے کہ

وَ اَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ (۳۴/۱۰)

ہے کو گرم کر کے نرم بنانا اور اس کو کوٹ کر چیزیں بنانے کا فن تسخیرِ دھات کا آغاز ہے جو اُن کے دَور
ں ہوا۔

جِفَانٍ كَالْجَوَابِ (۳۴/۱۳)

تالاب نما ٹب اور

قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ (۳۴/۱۳)

اور پڑی رہنے والی بڑی دیگیں بنائی گئیں۔

سخیرِ دھات کا یہ فن اپنے عروج کو پہنچا اور لڑائی بنانے کے لئے زرہ بنانے کا آغاز بھی اسی دَور میں ہوا اور
اب ذوالقرنین کے دَور میں تسخیرِ دھات اس عروج پر جا پہنچی۔ جب پہاڑی دَرّوں کو لوہے کے ٹکڑوں
رگرم تانبا ڈال کر جوڑ کر بند کیا گیا۔ چنانچہ ذوالقرنین فرماتے ہیں۔

اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ (۱۸/۹۶)۔

میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لاؤ۔

پھر اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا (۱۸/۹۸)

گلا ہوا تانبا ان پر ڈالو۔

سونا، چاندی، سیسہ، لوہا، تانبا وغیرہ تمام دھاتیں انسان کی تسخیر میں آگئیں۔ تیر کمان، شمشیر، نیزے،
رچھے، کلہاڑی، آری سب کچھ ایجاد ہو گیا اور اللہ کی رحمت سے انسانی تمدن اب وسائل والا بن گیا۔
کاشت کے لئے ہل اور کدال بن گئی۔ زراعت اور صنعت، ایک ساتھ ترقی کرنے لگے۔ چنانچہ دَرّہ بند کرنے
کے بعد ذوالقرنین نے فرمایا۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ (۱۸/۹۸)۔

گویا تسخیرِ دھات کا سارا عمل بذریعہ انبیائے کرام علیہم السلام وجود میں آیا جس میں خدائی راہنمائی کارفرما تھی۔
اور یہ سب کچھ رحمتِ ربی سے ممکن ہوا۔

اب ہم تسخیرِ ارض و سمٰوٰت کے سلسلہ میں اس اہم موڑ پر آ گئے ہیں جو عصرِ حاضر کا طُرّۂ امتیاز
ہے۔

بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى (۲۰/۶)۔

جو کچھ زمین اور آسمانوں کے درمیان ہے اور تحت الثریٰ میں جو کچھ پایا جاتا ہے

صاف ظاہر ہے کہ ارض و سماء کی تسخیر کا تصور نبوت و رسالت انسانی ذہن کو متاثر کرتا رہا۔ انسان کی غور و فکر کی صلاحیتیں بیدار ہوئیں اور ختمِ نبوت کے بعد انسان بلوغت کے درجہ پر پہنچ گیا کہ اسے انگلی پکڑ کر چلانے کی ضرورت نہیں، اب وہ خود چلنے کے قابل ہو گیا ہے۔ اب کسی آنے والے کے تصور کا سہارا اور انتظار ختم ہو گیا۔ اب فکرِ انسانی اور قرآنِ کریم ہی بڑا سہارا اور دائمی ورثہ بننے کے قابل ہے۔

ختمِ نبوت کے بعد "بَيْنَهُمَا" کی تسخیر سے برقیات، ایٹم اور مختلف گیسوں کی تصدیق ہوئی اور تسخیر تحت الثریٰ سے تیل، گیس، معدنیات وغیرہ وغیرہ پر تصرف حاصل کیا گیا۔ چنانچہ اب یورپ اور امریکہ کے انسانی تمدن کو تسخیر سب کچھ حاصل ہے۔ اگر کمی ہے، تو صرف اس بات کی ہے کہ وہ غیر متبدل اخلاقی اقدار، اقدارِ حیاتِ انسانی اور نوعِ انسانی کے مرکز کے سلسلہ میں بیت اللہ شریف، نوعِ انسانی کا ایک زندہ امام کو فکری طور پر معلوم نہیں کر سکتے۔ انھیں وحی کو تسلیم کرنا پڑے گا اور آخری کتاب قرآنِ کریم کو "حَكَمٌ" ماننا پڑے گا۔

نوعِ انسانی نے اقوامِ متحدہ کا کھیل دیکھ لیا۔ یہ ہمارے مسائل کا حل نہیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ

۱) تمام مسلمان ممالک اقوامِ متحدہ سے علیحدہ ہو جائیں اور خود کو صرف ایک "مسلم قوم" یا "ملتِ اسلامیہ" کے رنگ میں رنگ دیں۔

۲) اپنے عالمی مرکز بیت اللہ شریف کو زندہ کریں۔

۳) دنیائے اسلام کا ایک "زندہ امام" امیر المؤمنین کا انتخاب کریں۔ یہاں کسی آنے والے کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ ایک انتخاب کر لیں اور پھر اس پر متفق ہو جائیں۔

۴) سائنسی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ تمام تعیشات اور تفریحات کو قربان کر کے سائنسدان پیدا کرنے پر زور دیا جائے تاکہ ہماری کوئی درس گاہ بھی سائنس ماسٹر یا سائنسدان سے خالی نہ ہو۔

۵) قرآن کے متعین کردہ انسانی بنیادی حقوق پر عمل پیرا ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔

۶) تمام مسلم ممالک سے آمریت اور ملوکیت کو بتدریج ختم کر کے ڈھیلا ڈھالا قابلِ قبول مشاورتی نظام قائم کیا جائے جو "زندہ امام" امیر المؤمنین کے مقرر کردہ گورنر کے تحت ہو۔ یوں ساری دنیائے اسلام ایک مرکز کے تابع ہو جائے گی۔

۷) سودی نظام کو حرفِ غلط کی طرح فوراً مٹا دیا جائے۔

۸) دنیائے اسلام کے وسائلِ پیداوار کو تمام مسلمانوں کے مشترکہ ذرائع پیداوار تصور کیا جائے اور پسماندہ علاقہ جات کو ترجیح دے کر وہاں خرچ کیا جائے۔

۹) تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے اور نابالغ افراد کی ملازمت پر پابندی لگادی جائے۔

یوں وحیٔ خداوندی اور قوانینِ فطرت کی یکجائی سے دنیائے اسلام مستفید ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی بھی دوسرا طریق کار تجرباتی طور پر اپنی موت آپ مرجائے گا اور ہمیں منزل پانے میں دیر ہو جائے گی۔

اَیَبْتَغُوْنَ عِنْدَھُمُ الْعِزَّۃَ فَاِنَّ الْعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیْعًا (۴/۳۹)۔

تم عزت حاصل کرنے کے لئے روس اور امریکہ کے پاس جاتے ہو، یاد رکھو ساری عزت اللہ کے لئے ہے۔

سوال ۱۵:۔ اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَہٗ وَ قُرْاٰنَہٗ (۷۵/۱۷) ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ (۷۵/۱۹)۔ ارشاداتِ الٰہی سے کیا مراد ہے۔ نیز یہ کہ ان ہر دو آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ مقدس کردار سے متعلق تعبیر و تشریح کیا ہے؟

جواب:۔ نبوت سے پہلے کی علمی کیفیت میں حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کس معیار پر تھے۔ قرآن میں ہے:۔

وَ مَا کُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِہٖ مِنْ کِتٰبٍ وَّ لَا تَخُطُّہٗ بِیَمِیْنِکَ (۲۹/۴۸)۔

آپؐ اس سے پہلے لکھی ہوئی کتاب سے نہیں پڑھ سکتے تھے اور نہ داہنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے۔

وَ مَا کُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ یُّلْقٰٓی اِلَیْکَ الْکِتٰبُ اِلَّا رَحْمَۃً مِّنْ رَّبِّکَ (۲۸/۸۶، ۴۲/۵۲)۔

نہ آپؐ اس کے امیدوار تھے کہ آپؐ پر کتاب اُترے گی مگر یہ سب کچھ آپؐ کے ربّ کی رحمت سے ہوا۔

ان حالات میں آپؐ کو منصبِ نبوت و رسالت سے نوازا گیا۔ حاملِ نبوت کا ذوق و شوق اپنے اللہؐ سے کیسا اور کس شدت سے ہوتا ہے، کوئی غیر از نبی اس کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ قصۂ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں ہے کہ جب بنی اسرائیل بحر کے اس پار اُتر گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہو گیا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام جلدی میں طور پر جا پہنچے تاکہ خدا ان سے راضی ہو جائے۔ اللہ نے پوچھا۔

وَ مَا اَعْجَلَکَ عَنْ قَوْمِکَ یٰمُوْسٰی (۲۰/۸۳)۔

تجھے اپنی قوم سے الگ کر کے کون سی چیز جلدی میں یہاں لے آئی۔

موسیٰ علیہ السّلام جواب دیتے ہیں۔

وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی (۲۰/۸۴)

اے ربّ! میں تیری طرف جلدی آیا تاکہ تُو راضی ہو۔

"اللہ کی رضا کا ذوق و شوق" حاملِ نبوّت کے رگ و پے میں کس طرح جاری و ساری ہوتا ہے۔ یہ کوئی غیر از نبی نہیں جان سکتا۔ موسےٰ علیہ السّلام کے جواب میں اس کی یہی جھلک ملتی ہے تاکہ ربّ راضی ہوجائے۔ اسے راضی کرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے، ہر داستانِ نبوّت اسی محور کے گرد گھومتی ہے۔

جب حضور نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوئی۔ (سورۃ العلق)

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ۔ (۱)

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ۔ (۲)

اِقْرَاْ وَ رَبُّكَ الْاَكْرَمُ۔ (۳)

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ (۴)

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (۵)

یہی آیات تھیں یا کچھ اور، اس وقت حضورؐ کے ذوق و شوق کی جو کیفیت تھی، اس کی جھلک کو پیش کرنے کا کچھ اشارہ اس میں ملتا ہے۔

البتہ سوال میں جو آیات درج کی گئی ہیں، ان کی پوری وضاحت کے لئے اس سے پہلے کی ایک آیت کو بھی شامل کرنا ضروری ہے تاکہ تسلسل قائم رہے۔ نیز آیت (۲۰/۱۱۴) کو بھی دیکھ لیا جائے۔

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ (۷۵/۱۶، ۲۰/۱۱۴)

پڑھنے میں جلدی کرنے کی خاطر اپنی زبان کو نہ ہلایا کرو۔

یہ ہے قرآن پڑھنے کے ذوق و شوق میں جلدی۔ اس خاصۂ نبوّت پر ہم کوئی تبصرہ کرنے سے عاجز ہیں۔

قرآن عطا کرنے والے نے ذوق و شوق کی جلدی کو کچھ روکا اور فرما دیا۔

اِنَّ عَلَیْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ (۷۵/۱۷، ۲۰/۶)

آپؐ کو نبوّت دینے والے نے کہا کہ اس کو بطور حافظہ جمع کرنا یا آپؐ کے دل و دماغ کو جمع رکھنے کے قابل بنا اور پھر یہ بار بار پڑھا دینا ہمارے ذمّہ ہے۔

قرآن دینے والے نے ذوق و شوق کی قدر کی، تسلّی دی کہ جلدی نہ کرو، تمہارے حافظہ میں ڈالنا پڑھا دینا ہمارے ذمّہ ہے۔ تاریخ میں یہ ایک سنہری حوالہ بھی ملتا ہے کہ قرآن کے پہلے حافظ خود حضور نبیٔ اکر

صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔

ان آیاتِ کریمہ کے درمیان پھر ایک آیت چھوڑ دی گئی ہے، جو یوں ہے۔

فَإِذَا قَرَأْنَاهُ فَاتَّبِعْ قُرْآنَهُ (۷۵/۱۸)۔

پس جب ہم قرآن پڑھیں، تو پڑھنے میں ہماری پیروی کرو۔ نیز

عَلٰی قَلْبِكَ (۲/۹۷، ۲۶/۱۹۴) بھی قابلِ غور ہے۔

حضورؐ کو قرآن پڑھنے کی آواز کہاں سے اور کیسے آتی تھی جس کی وہ پیروی کرتے تھے۔ یہ کوئی غیر از نبی نہیں جان سکتا۔ ہم ایمان بالغیب کے مکلّف ہیں۔ ادب کی اس خاص بارگاہ میں تنقید و تبصرہ کرنے کی کیا مجال!

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵/۱۹)۔

پھر اس کو بیان کرتے رہنے کی صلاحیت عطا کرنا بھی ہمارے ذمّہ ہے۔

انسانی خصوصیت کے سلسلہ میں قرآنی شہادت ہے۔

عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵/۴)

انسان کو بیان کرنے کی صلاحیت عطا کی۔

ایک حوالہ ملاحظہ ہو۔

" اللہ نے اُسے اظہارِ خیالات کی صلاحیت دی ہے، یعنی یہ صلاحیت کہ وہ زبان اور قلم کے ذریعے اپنے ما فی الضمیر کو دوسروں تک پہنچا سکے۔ یہ خصوصیت انسان کو باقی حیوانات سے متمیّز کرتی ہے اور انسانی تہذیب و تمدّن کے عروج کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔" (لُغاتُ القُرآن، از غلام احمد پرویزؔ، ص۳۷)

اب ہم ان دو آیاتِ کریمہ میں بیان کردہ مقدّس کردار کی تعبیر و تشریح کی بابت کچھ عرض کرتے ہیں۔

جناب شیخ عطاء اللہ ایڈووکیٹ مرحوم گجرات نے " جَمْعُ الْقُرْآن " لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام اپنی اپنی کتاب یا صحیفہ خود جمع کر کے اُمّت کو دے کر جاتے تھے، بالکل اسی طرح حضور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن کتابی شکل میں جمع کر کے امّت کو دے کر گئے۔ لہٰذا " جَامِعُ الْقُرْآن " حضورؐ خود ہیں، نہ کہ کوئی اور۔ آج دنیا میں حضورؐ کا سب سے بڑا مشاہداتی معجزہ قرآن ہی ہے جس کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، نہ اس کا ثانی بنایا جا سکتا ہے۔

عربی مسلمانوں نے " رقِ منشور " کو ترقی دی تھی۔ بعد میں مسلمان غفلت میں کھو گئے۔ اہلِ مغرب نے کاغذ

کو ترقی دی اور سب سے اچھے کاغذ کا نام "بائیبل پیپر" رکھا، جبکہ مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ انھوں نے قرآن پریس میں چھاپنے کو ممنوع قرار دے دیا تھا۔ ترکی میں پہلی دفعہ قرآن چھاپا گیا اور یہ طریقہ رواج پا گیا۔ آج قرآنِ کریم کی اچھی طباعت کا معیار قائم ہو چکا ہے۔

ختمِ نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اُمتِ مسلمہ پر ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے دنیا بھر کی زبانوں میں تراجم کرائے اور ساری نوعِ انسانی تک قرآنِ کریم کا پیغام پہنچائے۔ یہی بَیَانُ الْقُرْآن ہمارا فریضہ ہے اور یہی سنتِ رسول اللہ اسی سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔ بیان القرآن سے متعلق اللہ تعالیٰ اور حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا مقدس کردار نزولِ قرآن، جمع القرآن اور حفاظتِ قرآن میں ایک سنہری باب ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵/۹)۔

ہم نے یہ ذکر (قرآن) نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں۔

جہاں تک متنِ قرآن کا تعلق ہے، اس کا بیان، اشاعت، سماعت اور خواندگی دنیائے اسلام میں جاری ہے لیکن اِس بَیَانُ الْقُرْاٰن سے وہ مقصد پورا نہیں ہو رہا، وہ انقلاب برپا نہیں ہو رہا، جو قرآن کا منشا تھا۔

ایسا کیوں ہوا؟

جب ہم یہی سوال قرآن کی بارگاہ میں لے کر جاتے ہیں، تو جواب ملتا ہے۔

وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا۔ (۲۵/۳۰)۔

اور رسولِ اکرمؐ بارگاہِ ربّ العزت میں پکار کر کہیں گے کہ اس قوم نے دکھاوے کے طور پر قرآن سے تعلق رکھا ہوا تھا، لیکن عملاً قرآن کو مہجور بنا رکھا تھا۔

الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ (۱۵/۹۱)۔

ان لوگوں نے قرآن کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔

آئیے ہم اپنی تاریخ اور اپنے اعمال میں ان جوابات کا جائزہ لیں۔ کیا واقعی ہم مجرم ہیں۔ بیان القرآن کے پردے میں ہم قرآن سے دوری کے اعمال کے مرتکب تو نہیں ہو رہے، ہمیں اپنی غلطیوں کا برملا اعتراف کر کے اس روش کو ترک کرنا ہوگا۔

منسوخ آیات

اگر ہیضہ کی وبا کے دوران کوتوالِ شہر کی طرف سے حکم ملے کہ صفائی کرنے کا حکم منسوخ ہے، تمام چھٹی کردو، تو اس سے جو حشر برپا ہوسکتا ہے، اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔

مسلم تہذیب تیزی سے پھیل رہی تھی۔ پورا قرآن ایک کتابِ انقلاب بنا ہوا تھا کہ قرآن کی کچھ آیات کو منسوخ قرار دے دیا گیا۔ اب اس مرض کا پتہ لگا کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا جا رہا ہے۔ پھر بھی شکریہ!

"یہ تو بعد میں علمائے کرام نے اپنے خیال سے بعض آیتوں کو بعض سے منسوخ ٹھہرایا۔ اس طرح پر انھوں نے پانصد آیتوں کو منسوخ ٹھہرادیا ہے مگر شیخ ابن العربی اور امام سیوطی نے فرمایا ہے کہ کل بیس آیات منسوخ ہیں اور شاہ ولی اللہ صاحب محدّث دہلوی نے فرمایا ہے کہ نہیں کل پانچ آیات منسوخ ہیں (فوزکبیر) مگر میرے نزدیک پانچ کیا، ایک آیت بھی منسوخ نہیں۔"

حصول تیسر البیان علےٰ اصول تفسیر القرآن — اپریل ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۰۱/۲۰۰

از عنایت اللہ اثری وزیر آبادی، مدرس دارالحدیث گجرات

یہ تھا بیان القرآن میں پڑنے والا وہ گھپلا، جو آیات کو منسوخ کر گیا۔

لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَ الْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ۔ (۴۱/۲۶)

کافروں نے کہا۔ یہ قرآن مت سنو، شور مچاؤ، یہ منسوخ ہو چکا ہے، اس پر عمل کی کیا ضرورت ہے۔ شاید اس طرح تم اپنے پروگرام کو غالب بنا سکو گے۔

اور واقعی وہ اپنے پروگرام میں ہم پر غالب آ گئے ہیں۔

بیان القرآن کا دوسرا فلسفہ یہ ہے کہ قرآن کی تشریح تصریفِ آیات سے کی جائے تاکہ قرآن میں تضاد نظر نہ آئے، وحدتِ فکر پیدا ہو۔

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (۴/۸۲)

کیا یہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات (تضادات) پاتے۔

اب تن کے بیان القرآن کے ساتھ مفہوم کا بیان القرآن بھی امتِ مسلمہ کے ذمہ ہے جو تصریف

آیات سے صحیح طور پر سمجھ میں آجاتا ہے، جس سے کوئی تضاد اور اختلاف باقی نہیں رہ سکتا۔ جب تک ایسا مشن ہماری زندگی کا مقصد نہ بن جائے گا، قرآن ہونے کے باوجود ہم قرآنی انقلاب سے دور رہیں گے۔ تہذیبی انفرادیت اُبھر کر سامنے نہ آسکے گی۔ اغیار کی ثقافت اور علوم و فنون میں کھو کر ہم تو اپنا تشخص پہلے ہی گنوا بیٹھے ہیں۔

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ

رسول اللہؐ نے فرمایا ہے کہ خبردار فتنہ واقعہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ اس سے کیونکر نجات ہوگی؟ آپؐ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے اور حق و باطل کے اندر قولِ فیصل ہے۔ جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا، ہلاک کرے گا اس کو اللہ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی، گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف لوگوں کو بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی، دارمی)

حقائق وعبر

...چہ عجب!

۲۶ اگست ۱۹۹۱ء کو جماعت اسلامی کے پچاسویں یوم تاسیس پر موچی دروازہ لاہور میں، جماعت اسلامی کی طرف سے ایک جلسۂ عام کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے جماعت اسلامی کے ایک سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب نے شریعت بل کو فراڈ بل قرار دیا اور جماعت اسلامی کے امیر اور جن دوسرے لیڈروں نے اس پر دستخط کئے تھے، ان کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا کہ دستخط کرتے وقت ان کی "مت ماری گئی تھی"۔ لیکن جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ "ایشیا" میں میاں صاحب کی جو تقریر شائع کی گئی ہے، اس میں اس اہم واقعہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں

چہ عجب! (ہفت روزہ ایشیا، بابت یکم ستمبر ۱۹۹۱ء)

۲۔ جہادِ افغانستان ۔ بلا تبصرہ

حکمت یار اور شیخ جمیل گروپوں میں جھڑپیں، ساٹھ ہلاک

زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائل راکٹ لانچر توپیں اور جدید اسلحے کا استعمال

پشاور (نمائندہ خصوصی) افغانستان کے آزاد صوبہ میں گلبدین حکمت یار اور شیخ جمیل الرحمٰن کے گروپوں میں گذشتہ پانچ روز سے جاری جھڑپوں میں ساٹھ سے زائد افراد جاں بحق اور پچاس سے زیادہ زخمی ہو گئے۔ پاکستان کے سرحدی علاقے سے ملحقہ افغانستان کے مجاہدین کے زیر کنٹرول صوبہ میں افغان مجاہدین کے گلبدین حکمت یار کی حزبِ اسلامی اور شیخ جمیل الرحمٰن کی حکومت امارات اسلامی کے درمیان گذشتہ دو ماہ سے خراب تعلقات سنگین نوعیت اختیار کر گئے جب دو ماہ قبل صوبہ کی حکومت امارات اسلامی نے مولوی محمد یونس خالص گروپ کے مورچوں پر گلبدین حکمت یار کے گروپ کے افراد کا قبضہ خالی کروایا جس میں امارات اسلامی کے تین محافظوں کو گلبدین حکمت یار کے گروپ کے افراد نے مار ڈالا۔ امارات اسلامی نے سارے علاقے میں کرفیو نافذ کر کے گلبدین حکمت یار گروپ کے تمام افراد کو صوبے سے

بے دخل کر دیا جس کے بعد مجاہدین کی باہمی چپقلش کے نتیجہ میں اس علاقہ میں درجنوں افراد مارے گئے افغانستان کے اس آزاد صوبے کے ذریعے پشاور اور چترال کے مابین ٹرانسپورٹ بھی چلتی ہے۔ اِدھر حزب اسلامی گلبدین حکمت یار گروپ کے افراد کا کہنا ہے کہ امارات اسلامی نے ان کے افغانستان میں جانے کا راستہ بند کر دیا جس کی وجہ سے خوست کے بعد ان کا لغمان اور مہمند میں حملوں کا پروگرام سبوتاژ ہو گیا۔ گذشتہ پانچ روز سے دونوں گروپوں میں دوبارہ شدید لڑائیاں شروع ہو گئی ہیں اور حزبِ اسلامی نے شینگل اور نورگل میں امارات اسلامی کی متعدد چوکیاں قبضہ کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔ اس لڑائی میں زمین سے زمین پر مار کرنے والے میزائل، راکٹ لانچر، توپیں اور جدید اسلحہ استعمال کیا جا رہا ہے۔ حزبِ اسلامی کے ذرائع کا کہنا ہے کہ ان کے گروپ نے کلاشنکوف کا علاقہ دو روز قبل قبضہ میں لے لیا، تو مخالفت گروپ کے تین افراد نے حملہ کیا جن میں سے چھ زندہ پکڑ لئے گئے اور پانچ مارے گئے۔ تاہم لڑائی کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات نہیں ملیں۔

۳۔ جماعت اسلامی اور خاندانی منصوبہ بندی

جماعت اسلامی کے ہفت روزہ ترجمان، ایشیا، کی ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں خاندانی منصوبہ بندی کے بارے ایک مبسوط مضمون شائع ہوا ہے جس میں خاندانی منصوبہ بندی کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے لئے قرآن و حدیث سے دلائل دینے کی بجائے، ان کیتھولک پادریوں کے اقوال نقل کئے گئے ہیں — جو خاندانی منصوبہ بندی کے مخالف ہیں۔ مضمون کے آخر میں، البتہ اسلام کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو کچھ یوں ہے:

> "اس بحث کے بعد میرے لئے یہ بتانا بہت آسان ہو گیا ہے کہ جس دینِ فطرت کے ہم پیرو ہیں وہ اس مسئلے میں ہماری کیا رہنمائی کرتا ہے۔ عام طور پر ضبطِ ولادت کے حامی حضرات جن احادیث سے "عزل (COITNS INTERRUPTNS) کا جواز نکال کر دکھاتے ہیں، وہ اس امر واقع کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ ان احادیث کے پس منظر میں تحدیدِ نسل کی کوئی عام تحریک موجود نہ تھی۔ اس زمانے میں سرکار رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کوئی شخص یہ فتویٰ پوچھنے کے لئے نہیں گیا تھا کہ حضورؐ ہم ایسی کوئی تحریک چلا سکتے ہیں یا نہیں، بلکہ وہاں تو مختلف اوقات میں بعض افراد نے محض اپنے انفرادی حالات پیش کر کے یہ دریافت کیا تھا کہ اس صورتِ حال میں ایک مسلمان کے لئے عزل کرنا جائز ہے یا نہیں۔ ان متفرق سائلوں کو حضورؐ نے جو جوابات دیئے تھے ان میں سے بعض میں آپؐ نے اس سے منع فرمایا، بعض میں اسے ایک فضول حرکت قرار دیا اور

آپؐ کے بعض جوابات سے یا آپؐ کے سکوت سے جواز کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ ان مختلف جوابات میں سے اگر صرف انہی جوابات کو چھانٹ لیا جائے جو جواز پر دلالت کرتے ہیں، تب بھی ان کو بس انفرادی ضبطِ ولادت ہی کے لئے دلیل بنایا جاسکتا ہے۔ اس کی بنیاد پر ایک عمومی تحریک جاری کر دینے کا جواز ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

(ہفت روزہ ایشیاء بابت ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء، صفحات ۱۳، ۱۴)

خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں نو احادیث ہیں جن میں آٹھ میں واضح الفاظ میں اس کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ آٹھوں احادیث صحیح ہیں، نویں حدیث جس میں خاندانی منصوبہ بندی کی مخالفت کی گئی ہے، اُسے ائمہ حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے۔ ان احادیث کی روشنی میں چاروں فقہی مذاہب کے بانی ائمہ نے خاندانی منصوبہ بندی کو جائز قرار دیا ہے۔ (المختصر الفتاوی المصریۃ تالیف امام ابن تیمیہ ص ۴۳۱)

حنفی فقہ کے بانی امام ابوحنیفہؒ نے اس کا جواز قرآنِ مجید سے ثابت کیا تھا۔ (احکام القرآن از قاضی ابوبکر جصاص جلد اوّل ص ۴۱۷)۔ حضرت عمرو بن العاصؓ، جو ایک مشہور صحابی تھے، جب مصر کے گورنر مقرر ہوئے، تو انہوں نے وہاں آبادی کی کثرت دیکھی۔ انہوں نے آبادی کو کم کرنے کے لئے وہاں پر خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک چلائی۔

(فتوح مصر ص ۱۳۹)

۴۔ مبہم اصطلاحات

علماء حضرات کی ادارت میں شائع ہونے والے اکثر جریدے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موجودہ بحران کا واحد حل، اسلامی نظامِ تعلیم کی ترویج میں ہے۔ ماہنامہ 'الحق' نے بھی اپنی جولائی ۱۹۹۱ء کی اشاعت میں ایک مقالہ اس عنوان سے شائع فرمایا ہے، لیکن عوام اب تک یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ وہ اسلامی نظامِ تعلیم ہے کیا؟ اس سے ان حضرات کی مراد اگر درسِ نظامی ہے، تو وہ اس ملک میں صدیوں سے رائج ہے اور عوام جانتے ہیں کہ درسِ نظامی نے اب تک کتنے بحرانوں کو جنم دیا ہے۔

باب المراسلات

۱۔ ناجائز اسلحہ

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔

ناجائز اسلحہ جمع کرنے کی مہم ہمارے ہاں زور و شور سے جاری رہی، اشتہارات پر کروڑوں روپیہ خرچ ہوا، عوام کو ڈرایا گیا، دھمکایا گیا، انسانیت کا واسطہ دیا گیا ـــــ لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ناکامی کے اسباب جاننے کے لئے اب کمیٹیاں قائم ہوں گی مگر دنیا جانتی ہے کہ ناکامی کا سب سے بڑا سبب وہ اسلحہ ہے جسے جائز اسلحہ کہا جاتا ہے جائز اسلحے کی نمائش جاری رہے گی، تو اس کی آڑ میں ناجائز اسلحے کا کاروبار بھی چلے گا۔ یہاں نہ عوام کچھ کر سکتے ہیں نہ پولیس۔ مثال کے طور پر ایک مخبر پولیس کو اطلاع دیتا ہے کہ فلاں ہوٹل میں بڑی بڑی مونچھوں والے دو آدمی کلاشنکوف لئے بیٹھے ہیں، ان میں سے ایک کی شکل فلاں اشتہاری مجرم سے ملتی ہے۔ پولیس اس مخبری پر ان افراد کا گھیراؤ کرتی ہے۔ جواب میں مونچھوں والے لائسنس دکھا کر پولیس پر برس پڑتے ہیں۔ پریس میں پولیس کے رویے کے خلاف شور مچ جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس کو ایک اور نشاندہی ہوتی ہے کہ فلاں بدمعاش کلاشنکوف لئے فلاں دکان پر حجامت بنوا رہا ہے۔ پولیس، ظاہر ہے کہ اس خفت کے پیشِ نظر، جو وہ ابھی ابھی اٹھا چکی ہے، دوسری اطلاع پر پہلے جیسی گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کرے گی جس سے اس بدمعاش کو تازہ دم ہو کر ایک اور وارداتیں کرنے کا موقع مل جائے گا۔ نہ جائز "ناجائز" کا چکر ہوتا نہ پولیس تذبذب کا شکار ہوتی۔ سوال یہ ہے کہ یہ جائز اسلحہ ہے کیا کیا جائز اسلحہ قتل و غارت میں استعمال نہیں ہوتا؟ کیا اس بات کی ممانعت موجود ہے کہ جائز اسلحہ رکھنے والے غلط کام نہیں کرتے؟ کیا جائز اسلحہ سے چلائی ہوئی گولی بتا دیتی ہے کہ مجھے کس ہتھیار سے داغا گیا ہے اور لبلبی پر انگلی کس کی تھی؟ کیا فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ خون صرف ناجائز اسلحہ ہی سے بہایا جا سکتا ہے؟ جائز اسلحہ میرے نزدیک وہی ہے جسے استعمال کرنے سے ستارۂ جرأت ملتا ہے یا نشانِ حیدر۔ وہ اسلحہ کیونکر جائز ہو سکتا ہے، جسے

استعمال کرنے والا، لائسنس رکھنے کے باوجود، حوالات میں جا پہنچتا ہے۔ رہی تحفظِ خویش کی بات، تو لوگ ایسی دشمنیاں کیوں پالتے ہیں کہ تحفظ کے لئے انہیں اسلحے کے انبار لگانے پڑیں۔ آخر وہ لوگ بھی تو زندہ ہیں جو تحفظِ خویش کے لئے نہ اسلحہ خرید سکتے ہیں نہ ان میں لائسنس فیس ادا کرنے کی سکت ہے اور پھر دنیا میں ایسے ملک بھی موجود ہیں جہاں اسلحہ رکھنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اسلحہ نہ ہمارے کسی مرض کا علاج ہے نہ ہماری ضرورت۔ اس لئے حکومت اگر اسلحہ کی دوڑ ختم کرنے میں مخلص ہے، تو اسے چاہیئے کہ کچھ وقت کے لئے ہر قسم کے اسلحہ پر پابندی عائد کر کے ملک کو ایک دفعہ اسلحہ سے پاک کر دے تاکہ نہ جائز، ناجائز کا مغالطہ باقی نہ رہے۔ نہ کوئی ہتھیار بردار عوام اور پولیس کی نظر سے بچ کر نکل سکے۔ ایسا کرنے سے ہو سکتا ہے، لائسنس فیس کی مد میں حکومت کی آمدنی متاثر ہو، لیکن اوّل تو اصلاحِ معاشرہ کے مقابلے میں یہ اتنا بڑا خسارہ نہیں ہوگا اور اگر یہ نقصان برداشت کرنا حکومت کے لئے ممکن نہ ہو، تو بھی اِسے ترکِ اسلحہ قسم کا سرچارج لگا کر پورا کیا جا سکتا ہے، لیکن اس کے لئے اسلحہ کی موجودگی سے اعراض برتنا نہ حکومت کے لئے سودمند ہوگا، نہ عوام کے لئے مفید۔

نیازمند
حسین امیر فرہاد۔ پشاور

سُوئے حرم

مکرمی و محترمی ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

السّلام علیکم! بندہ بذریعہ طلوعِ اسلام، مسلمان ہونے کا اعلان کرنا چاہتا ہے۔ میں جب سکول کا طالب علم تھا، تو میں نے والد صاحب کی خواہش پر اہلِ سنّت جماعت کے پاس قرآن اور مذہب کو سیکھنا شروع کیا۔ جس گھر میں مَیں نے آنکھ کھولی، وہ گھرانہ اہلِ سنّت جماعت (بریلوی) فرقے کا تھا۔ ان کی تمام اسلامی رسوم و رواج بدرجۂ اتم باقی تھیں، جبکہ میرا ذہن سوچنے والا تھا کہ ہر جمعرات کو مرے ہوئے عزیز ختم شریف والا کھانا لینے کیسے آتے ہیں۔ اگر آتے ہیں، تو ہمیں نظر کیوں نہیں آتے۔

اہلِ سنّت جماعت کے مدرسہ والے کہتے کہ دہابیوں کے ہاں نہ جانا، وہ کافر ہیں، گستاخِ رسول ہیں۔ میں سوچتا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ خدا ایک، رسول ایک، قرآن ایک، پھر وہ کافر کیسے ہیں۔ اسی تجسّس نے مجھے اہلحدیث کے ہاں پہنچا دیا۔ میں نے دیکھا کہ قرآن تو ایک ہی ہے مگر دونوں کی تشریح و تفسیر میں زبردست تضاد ہے۔ اس طرح مجھ میں مزید فرقوں کو پڑھنے کا تجسّس اُبھرا۔ پھر میں نے اہلِ تشیع (فقہ جعفریہ) کو پڑھا اور آخر میں احمدیہ جماعت کو بھی۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاید اسلام ہندوازم کی ارتقائی شکل ہے۔ یوں میں نے اسلام چھوڑ دیا۔ لادین ہو کر

دیگر مذاہب گرنتھ، گیتا وغیرہ کے علاوہ سوشلزم، کمیونزم اور عیسائیت کا مطالعہ کرتا رہا۔ عیسائیت نے مجھے زبردست روحانی اطمینان دیا، لیکن ذہنی الجھنیں ابھی تک باقی تھیں۔ شروع میں پروٹسٹنٹ عیسائی بنا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ پروٹسٹنٹ نسبت کے بارے میں بائبل کے حکم کو نہیں مانتے۔ پھر میں سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ فرقے میں شامل ہو کر عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس سے پہلے پروٹسٹنٹ فرقہ میں بھی میں عیسائی مشنری کا مبلغ تھا۔ پھر میں نے اپنی زندگی میں بیسیوں مسلمانوں کو عیسائی بنایا۔ میں اپنے ایک کلاس فیلو دوست محمد داؤد کو بھی عیسائی بنانا چاہتا تھا۔

کسی کو عیسائی بنانے کے لئے پہلے محبت اور رفاقت دکھانی پڑتی ہے اور پھر بعد میں دولت۔ جب محمد داؤد کو عیسائی بنانے کے لئے میں ہر وقت اس کے ساتھ رہنے لگا، تو وہ مجھے شاہ سنز انڈسٹریز ملتان میں علامہ غلام احمد پرویزؒ کے قرآنی درس پر لے جانے لگا۔ مجھے قرآن کے نام سے نفرت ہو گئی تھی۔ دو ہفتے تو میں نفرت ہی کے ساتھ پرویزؒ صاحب کو سنتا رہا مگر تیسرے ہفتے مجھے یوں لگا، جیسے پرویزؒ صاحب میرے اندر کے انسان کی ترجمانی کر رہے ہوں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں قرآن کے عظیم فلسفۂ حیات کی طرف راغب ہوتا چلا گیا۔ پھر تو ہر جمعہ سورج نکلتے ہی مجھ پر ایک نشہ سا طاری ہونے لگ جاتا تھا اور میں ٹھیک نو بجے شاہ سنز انڈسٹریز پہنچ کر درسِ قرآن سُن کر سکون حاصل کرتا۔ ان ہی دنوں ملتان سے کچھ احمدی دوست مجھے عیسائیت کے خلاف لٹریچر فراہم کرنے آئے۔ یقیناً احمدی عیسائیت کے اسپیشلسٹ ہیں۔ تحریفِ بائبل اور بائبل میں محمد رسول اللہؐ کی پیشینگوئی کے متعلق انہوں نے مجھے اتنا مواد دیا کہ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں جھوٹی عیسائیت کو چھوڑ دوں۔ دوسری جانب علامہ غلام احمد پرویزؒ کافرقوں سے پاک انقلابِ قرآن پر مبنی اسلام میرے خمیر کو دعوت دے رہا تھا۔ آخرکار دس سال بعد، ۲۱ اگست ۱۹۹۱ء کو میں نے بابا جی پرویزؒ سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ روزنامہ پاکستان، لاہور کو انٹرویو میں، میں نے بتایا تھا کہ میں نے اسلام علامہ اقبالؒ اور علامہ پرویزؒ سے متاثر ہو کر قبول کیا ہے، ورنہ آج تک علامہ پرویزؒ کے سوا مجھے کہیں سے بھی فرقوں سے پاک اسلام نہیں ملا۔ اگر آج میری راہنمائی پرویزؒ نہ کرتا، تو شاید ساری زندگی میں کفر میں گزارتا اور کبھی اسلام میں واپس آنے کی نہ سوچتا۔ پاکستان میں ہزاروں مسلمان عیسائی ہو چکے ہیں مگر میں پہلا اور واحد آدمی ہوں جس نے دوبارہ اسلام قبول کر لیا۔ مجھے اخبار والوں سے شکوہ ہے کہ انھوں نے پرویزؒ کا حوالہ نہیں دیا، جبکہ پرویزؒ نے مجھے ایک نئی زندگی بخشی ہے۔

مخلص

انتخاب ابنِ آدم (نومسلم)
پی او بکس نمبر ۳۵۹۔ ملتان۔

۳۔ جو دوا کے نام پر زہر دے۔

محترم ایڈیٹر صاحب۔ آداب۔

میں آپ کے مؤقر جریدے کی وساطت سے حکومت کی توجہ ایک ایسے بھیانک کاروبار کی طرف دلانا چاہتا ہوں جو علاج معالجے کے مقدس نام سے جاری ہے۔ ہمارے ہاں آجکل پست ذہن رکھنے والے اکثر ڈاکٹر اور حکیم اپنے نسخوں میں کارٹی سون (CARTISONE) نامی دوا کا بے محابا استعمال کر رہے ہیں۔ کارٹی سون ایک سریع الاثر زہر ہے جس سے جسم میں قوتِ مدافعت ختم اور اعصابی نظام مضمحل ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ مرض کی علامات دبانے میں یہ زہر اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اس لئے بعض حالات میں مریض کی جان بچانے کے لئے اس کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے اس لئے اس کا شمار جان بچانے والی دواؤں میں ہوتا ہے مگر جادو کی یہ پڑیا جب سے ہمارے معالجوں کے ہاتھ لگی ہے، وہ اسے اپنے نسخوں میں جس فراخدلی سے استعمال کر رہے ہیں اس کا اندازہ اس زہر کی کھپت اور مریضوں کی لمبی لمبی قطاروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ معالج اپنی مسیحائی کا لوہا منوانے کے لئے مریض کو بتائے بغیر اس کی دوا میں کارٹی سون کا اضافہ کر دیتا ہے۔ کارٹی سون ملی دوا کی پہلی ہی خوراک سے مریض کو ایسا سکون ملتا ہے کہ وہ اپنے معالج کی فنی مہارت کا دل سے قائل ہو جاتا ہے اور پھر کارٹی سون ملی دوا کھاتے کھاتے دائم المریض بن کر معالج کا مطب آباد رکھتا ہے۔ پست سطح کے لالچی معالجوں کی یہ روش اس وقت ملک گیر وبا کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ یہ معالج اپنے کلینک آباد رکھنے کے لئے جس سفاکی سے یہ میٹھا زہر قوم کی شریانوں داخل کر رہے ہیں۔ اسے اگر روکا نہ گیا تو ہماری آنے والی نسل اپاہج ہو گی یا دائم المریض۔ ثبوت کے طور پر آج بھی ایسے بے شمار نوزائیدہ بچے ہسپتالوں میں تڑپتے نظر آتے ہیں، جن کی ماؤں کو دورانِ حمل کارٹی سون کا اندھا دھند استعمال کرایا گیا تھا۔ اب یہ بچے کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں گے۔

نظر آتا ہے کہ بدقماش معالج کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو یہ زہر دے کر راتوں رات امیر بننے کی فکر میں ہے۔ سچ پوچھیں، تو کوئی ڈاکو، کوئی رہزن، کوئی دہشت گرد اس قوم کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا، جتنا خدمتِ خلق کا لبادہ اوڑھے آج کا یہ معالج پہنچا رہا ہے اور لطف یہ کہ دہشت گرد کسی کو ہلاک کر دے تو گردن زدنی قرار پاتا ہے جب کہ یہ معالج روز روشن میں چند سکوں کے لئے ایک مریض اور اس کی پوری نسل کو تباہی کے گڑھے میں دھکیل کر بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ عوام کے لئے چونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ ذمہ دار اور غیر ذمہ دار معالجوں میں تمیز کر سکیں۔ اس لئے حکومت سے درخواست ہے کہ وہ اس صورتِ حال کا نوٹس لے کر ایسی تدابیر اختیار کرے کہ لالچی معالجوں اور عطائیوں کے لئے کارٹی سون کا استعمال نفع بخش نہ

رہے۔ یہ مقصد کسی حد تک کارٹی سون کی قیمت بڑھا کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس وقت یہ زہر اتنا سستا ہے کہ ایک روپیہ خرچ کر کے ۱۰/۲۰ روپے بھی کما لیتا ہے اور عارضی سکون پہنچا کر مریض کو ہمیشہ کے لئے اپنا گاہک بھی بنا لیتا ہے۔

بہی خواہانِ قوم، رفاہی اداروں، نیک سیرت معالجوں اور قومی پریس سے بھی التماس ہے کہ وہ اس قومی المیے کا نوٹس لیں۔

واقفِ حال
ڈاکٹر شہزاد ہاشمی، ایم بی بی ایس
ڈیرہ غازی خان

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

شہر	چک گ ب/۵۰۹ ، ماموں کانجن
جگہ	بر مکان ڈاکٹر محمد اقبال عامر
وقت	۳ بجے بعد نمازِ جمعہ

اشتیاق احمد۔ کینیڈا۔

اراکینِ تحریکِ طلوعِ اسلام کے نام

ماہنامہ طلوعِ اسلام کا مئی ۱۹۹۱ء کا شمارہ پڑھا۔ اس میں کہیں اُمّتِ مسلمہ کی غلط نگہی کا رونا رویا گیا ہے اور کہیں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیئے اور کیا کر رہے ہیں۔ کہیں مکافاتِ عمل کی سخت گیری کا ذکر ہے، تو کہیں تاریخ کے فیصلوں کا بیان۔ یہ سب کچھ درست، لیکن قرآنی تعلیمات کی روشنی جو مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کی شب بیداری سے ہم تک پہنچی ہے، کیا اس کا یہی مصرف ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچا دیا جائے اور بس۔ قرآنی اقدار اگر آج بھی اعلیٰ، ارفع، مؤثر اور قابلِ عمل ہیں اور ہماری تحریک کا مقصد قرآنی تصورات کے مطابق اپنے اندر انقلاب پیدا کرنا ہے، تو ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کردار کی لذّت سے کیوں ناآشنا ہیں۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ

WORN OUT IDEAS HAVE NEVER RISEN TO POWER AMONG A PEOPLE WHO HAVE WORN THEM OUT.

اس فیصلے کی روشنی میں ہمارے پاس دو ہی راستے ہیں، یا تو قرآن کو بھول جائیں یا اس شمع تابندہ کی روشنی کو دوسروں تک پہنچانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے اندر جذب کرنے کا بھی سوچیں اور اس طرح نہ صرف اپنی زندگی کو قرآنی تعلیمات کے سانچے میں ڈھالیں، بلکہ اس بنیادی اکائی کی تربیت کا بھی اہتمام کریں جسے عرفِ عام میں کنبہ کہا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآنی معاشرہ میں کردار سازی کا عمل نسبتاً آسان ہو جاتا ہے، لیکن یہ حقیقت بھی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیئے کہ قرآنی معاشرہ جب بھی وجود میں آیا، انہی لوگوں کے ہاتھوں وجود میں آئے گا، جن کے قلب و ذہن قرآنی اقدار کے سانچے میں ڈھل چکے ہوں گے۔ کاش یہ سعادت بھی ہم وابستگانِ فکرِ قرآنی کے حصّہ میں آتی، لیکن ہماری حالت تو یہ ہے کہ اس متاعِ حسنہ کو دوسروں تک پہنچا کر

خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس انتظار میں ہیں کہ جونہی قرآنی معاشرہ متشکل ہوا ہم اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ کہتے ہوئے اس میں شامل ہو جائیں گے ــــ یہ مذہب ہے ــــ دین نہیں ــــ مذہب کا مقصد وعظ کہنے سے پورا ہو جاتا ہے دین ہم سے DEMONSTRATOR بن کر سامنے آنے کا مطالبہ کرتا ہے۔ لہٰذا خدا کی کتابِ عظیم کے ساتھ عہدِ وفا باندھا ہے، تو ہمیں اپنی کمزوریوں کا برملا اعتراف کر کے پہلے اپنے آپ کو قرآنی اقدار کے سانچے میں ڈھالنا ہوگا ــــ یہی فرمانِ خداوندی ہے اور یہی سنّتِ رسولؐ۔

قرآنی تعلیم بچوں کے لئے

قاسم نوری

عظیم ترین مثالی بچہ ﷺ

السلام علیکم بچو! اسلامی کیلنڈر کے مطابق یہ مہینہ "ربیع الاوّل" کا ہے۔ اس مہینے کی نو تاریخ کو اس دنیا میں ایک ایسے بچّے نے جنم لیا تھا جسے بڑے ہو کر انسانی تاریخ کا سب سے بڑا قائد (LEADER) بننا تھا اور جب تک یہ دنیا قائم ہے اور اس دنیا میں جب تک آخری انسان زندہ ہے اس کی ہدایت اور قیادت کے لئے ایک "ماڈل" اور آئیڈیل کی حیثیت اختیار کرنی تھی۔ ــــ آج ہم آپ کو اُس تاریخ ساز بچّے کی وہ باتیں بتائیں گے جن کی وجہ سے وہ دُنیا کا عظیم ترین بچّہ اور مکمّل ترین انسان کہلایا اور جو بھی بچّہ یا بڑا اُن باتوں کو اپنا لے گا وہ بھی عظیم بن جائے گا ــــ

یہ ایک ہزار چار سو اکیس سال پہلے کی بات ہے۔ بہار کا موسم تھا۔ پیر کا دن اور پریل کی بیس تاریخ تھی اور عیسوی سال اور کیلنڈر کے مطابق سن ۵۷۱ء تھا۔ عرب کے چھوٹے سے شہر، مکّہ، کے سب سے بڑے سردار عبدالمطلب کے ہاں اُن کے پوتے کی پیدائش ہوئی ــ یہ بچّہ اپنی پیدائش کے وقت ہی یتیم تھا۔ صرف دو تین ماہ پہلے اس بچّے کا والد، جن کا نام عبداللہ تھا ــ اور جو تجارت کی غرض سے مکّہ سے ملک شام جا رہے تھے کہ راستے میں بیمار ہو گئے اور مدینہ نامی ایک شہر میں انتقال کر گئے۔ محترم عبداللہ کی شادی نئی نئی ہوئی تھی اور اُن کا یہ پہلا بچّہ تھا ــ جناب عبداللہ اور ان کی محترم بیوی 'آمنہ' کو اپنے بچّہ کی بڑی تمنا تھی۔ دونوں اپنے بچّے کے بڑے حسین خواب دیکھا کرتے تھے اور اس کے متعلق بڑے بڑے منصوبے بناتے رہتے تھے ــ جناب عبداللہ سوچتے تھے کہ جب وہ تجارت کے سفر سے واپس لوٹیں گے تو بچّے کی

پیدائش کے موقع پر بہت بڑا جشن منائیں گے لیکن وہ تو اس بچّے کی پیدائش سے پہلے ہی انتقال کر گئے اور بچّہ تو بچّہ وہ تو مرتے وقت اپنی بیوی آمنہ کا بھی چہرہ نہ دیکھ سکے اور چند مہینے کی بیاہی ہوئی دلہن بیوہ ہو گئی ـــــ مکّہ کے سردار عبدالمطلب کو اس کا بے حد صدمہ تھا۔ جوان بیٹے کی موت اور نئی نئی دُلہن کے بیوہ ہو جانے کا خیال کرکے وہ اکثر رو پڑتے تھے اور جب انہیں یہ خیال آتا کہ ان کے مرحوم بیٹے کا جو بچّہ اس دنیا میں آنے والا ہے وہ پیدائشی طور پر یتیم ہوگا یعنی جب وہ آنکھیں کھولے گا تو اِس دنیا میں اس کا باپ ہی موجود نہیں ہوگا تو ان کا دل تڑپ اُٹھتا ـــــ وہ بے چین ہو جاتے ـــــ پھر انھوں نے ارادہ کر لیا کہ اس بچّے کو یتیم ہونے کا احساس نہیں ہونے دیں گے ـــــ جو جو ارمان اور خواہش اُن کے بیٹے عبداللہ کے دل میں تھیں اُنھیں بھی وہ پورا کریں گے۔

چنانچہ جب اس بچّے کی پیدائش ہوئی تو سردار عبدالمطلب بہت خوش ہوئے اور اُنھوں بہت بڑا جشن منایا۔ پھر اس بچّے کا ایسا نام رکھا جو اس سے پہلے اس کرّۂ ارض پر کسی انسان نے کسی بچّے کا نام نہیں رکھا تھا۔ جانتے ہو بچّو وہ نام کیا تھا؟ وہ نام تھا مُحَمَّدؐ ـــــ سردار عبدالمطلب نے جب اس نام کا اعلان کیا تو جشن میں موجود ہر شخص نے حیرت کا اظہار کیا اور تعجّب سے پوچھا کہ " اے سردار تم نے اپنے پوتے کا نام محمدؐ کیوں رکھا ہے؟ یہ تو بڑا عجیب نام ہے۔ یہ نام اس سے پہلے کبھی کسی نے نہیں رکھا ـــــ اور یہ نام کسی بھی انسان کا کیسے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ اس کے معنی ہیں " وہ جس کی حمد کی جائے "۔ اور حمد تو صرف اللہ ہی کی ہوا کرتی ہے "۔ سردار عبدالمطلب نے فرمایا " میں چاہتا ہوں اس میں وہ سارے اوصاف موجود ہوں جو اللہ کسی انسان میں دیکھنا چاہتا ہے اور جن کی بدولت ہر شخص اس کی تعریف پر مجبور ہو جائے ـــــ " اُن کی والدہ نے ان کا نام ' احمدؐ ' رکھا اور یہ دونوں ناموں سے پکارے جانے لگے ـــــ

پیارے بچّو! اس دَور میں ایک بڑا عجیب اور دل چسپ دستور ہوا کرتا تھا۔ آپ اُسے فیشن بھی کہہ سکتے ہیں۔ سردار اور بڑے گھرانوں کی مائیں اپنے نوزائیدہ بچّوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتی تھیں بلکہ دیہاتی اور خانہ بدوش قبیلوں کی عورتوں کو دو سال کے لئے اپنے بچّے دیدیا کرتی تھیں تاکہ وہ ان بچّوں کو اپنا دودھ بھی پلائیں اور اُن کی پرورش بھی کریں۔ یہ عورتیں مہذّب، ذہین، باکردار اور صحت مند ہوا کرتی

تھیں۔ اس دستور کی وجہ سے مکہ شہر میں ہر سال دو مرتبہ یعنی چھ چھ ماہ کے بعد ان دیہاتی عورتوں کا میلہ لگا کرتا تھا۔ اور اردگرد کی دیہاتی خانہ بدوش قبیلوں کی عورتیں اکٹھی ہو کر میلہ میں شریک ہوا کرتی تھیں اور بڑے گھرانوں کے لوگ اپنے بچوں کو ان کے حوالے کر دیتے تھے اور اس کے معاوضہ میں ان عورتوں کو بڑے بڑے انعام و اکرام، عزت اور دولت مل جایا کرتی تھی۔ تو بچو، محمد نامی اس بچے کی پیدائش کے تھوڑے ہی دن بعد مکہ میں ان عورتوں کا میلہ لگا۔ ان عورتوں میں ایک خاتون بھی آئی تھیں جن کا نام حلیمہ سعدیہ تھا۔ محمد کی امی نے اپنا بچہ اُن کے سپرد کر دیا۔ وہ بچے کو اپنے قبیلے میں لے گئیں اور دو سال کے بجائے چھ سال تک بچے کو اپنے پاس رکھا اور بڑے لاڈ پیار سے اس کی پرورش کی۔

پیارے بچو! ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا کہ دنیا میں صرف تین طرح کے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ ہوتے ہیں جو اگر پیدا نہ بھی ہوتے تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ بس جانوروں کی طرح پیدا ہوئے، پلے بڑھے کھایا پیا اور پھر مر گئے۔ نہ دنیا کو ان کے پیدا ہونے کا پتہ چلا نہ مر جانے سے کچھ فرق پڑا۔ دوسرے وہ ہوتے ہیں جن کو تاریخ بڑا بناتی ہے اور تیسرے وہ ہوتے ہیں جو خود تاریخ بنایا کرتے ہیں اور ایسے لوگ کتابوں میں ہی نہیں دلوں اور روحوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ مرنے کے بعد بھی دنیا اتنے ادب، احترام اور عزت سے ان کا نام لیتی ہے کہ جہاں نام سُنا عقیدت سے سر جھک گئے۔ جانتے ہو، یہ مقام، یہ عزت و احترام کس بات سے ملتا ہے اور کس بات سے ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔ وہ ہے اخلاق و کردار اور محنت اور دوسرے انسانوں کی بقا و فلاح کے لئے کام کرنے کا جذبہ۔

محمد نامی اس بچہ نے جو مکہ کے سب سے بڑے سردار کا پوتا اور سب سے بڑے قبیلے قریش کا فرد تھا، جانتے ہو کیا کیا کام کئے۔ وہ چرواہا بنا اور بکریاں چرائیں — وہ موچی بنا اور اپنی جوتیاں گانٹھیں، وہ راج، مزدور بنا اور گھر اور مسجد بنائی۔ وہ تاجر بنا اور سازو سامان خریدا اور بیچا، وہ سپاہی بنا اور جنگیں لڑیں، وہ ٹیچر بنا اور لوگوں کو تعلیم دی، وہ جج بنا اور عدل و انصاف کیا — وہ ثالث بنا اور لوگوں کے جھگڑے دُور کرائے۔ امین بنا اور دوست دشمن سب کی امانتوں اور چیزوں کی حفاظت کی، کبھی لالچ نہیں کیا اور کسی کی چیز کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا — کبھی لڑائی جھگڑا نہیں کیا، گالی نہیں دی، کسی کی چغلی نہیں کھائی،

کسی کو دھوکا نہیں دیا، کسی لڑکی پر بُری نظر نہیں ڈالی ــــ گندی باتوں اور بے ہودہ کھیلوں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ جو کام دوسروں کو کہے پہلے وہ خود کیا کرتے تھے ــــ ہمیشہ سچ بولا، غلط کام میں کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا ــــ وہ بچّوں میں سب سے پیارے بچّے تھے۔ اپنی انہی خوبیوں کی بدولت سارا شہر ان کی عزت کرتا تھا اور یہی خوبیاں تھیں کہ وہ رحمت للعالمین یعنی قیامت تک آنے والے زمانوں کے لئے رحمت قرار پائے ــــ علاقوں اور ملکوں کی حکمرانی ہی نصیب نہیں ہوئی، بلکہ آج بھی کروڑوں انسانوں کے دلوں اور روحوں پر ان کی حکومت ہے ــــ کارلائل نے کہا "تاریخِ عالم میں اب کوئی ایسا انسان نہیں آئے گا" ــــ DORSEY نے کہا۔ "وہ نہ ہوتا تو دورِ حاضرہ کی تہذیب بھی نہیں ہوتی" ــــ GIBBON نے کہا "اب ہماری نگاہ اس کے لائے ہوئے ناقابلِ فراموش انقلاب پر مرکوز ہے جس نے دنیا کی قوموں کے قلب پر ایک نرالا اور دائمی نقش قائم کر دیا۔" (معراجِ انسانیت ص ۵۶)

محترم اور پیارے بچّو! یہ اس یتیم بچّے محمد کی کہانی ہے جسے اللہ نے پوری نسلِ انسانی کے لئے "ماڈل" کی صورت میں منتخب کیا اور انہیں نبوّت عطا کی اور پھر ان پر نبوّت ختم بھی کر دی یعنی ان کے بعد قیامت تک اب کوئی نبی نہیں آئے گا ــــ اور جو بچّہ بھی ان کی باتوں کو اپنائے گا، دنیا میں مثالی اور عظیم بن جائیگا۔

علامہ غلام احمد پرویزؒ

الدّین

الاسلام پر انفرادی طور پر عمل پیرا نہیں ہوا جا سکتا۔ اجتماعی طور پر ہی ہوا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک نظامِ حیات کے تابع ہے جسے الدّین کہہ کر پکارا گیا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے نظامِ مملکت کہا جاتا ہے۔ قرآن میں قوانینِ حکومت یا نظامِ مملکت کیلئے یہی لفظ آیا ہے۔ مثلاً سورۂ یوسف میں ہے کہ حضرت یوسفؑ اپنے بھائی (ابن یامین) کو اپنے پاس روک لینا چاہتے تھے۔ لیکن مَا كَانَ لِيَأْخُذَ أَخَاهُ فِي دِينِ الْمَلِكِ (۱۲/۷۶) وہ وہاں کے بادشاہ کے قانونِ حکومت کی رُو سے ایسا کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں دین کا لفظ قانونِ حکومت کیلئے آیا ہے۔

سورۃ النور میں زانی اور زانیہ کی سزا کا حکم آیا ہے جس کے ساتھ کہا گیا ہے کہ یہ سزا جماعتِ مومنین کے سامنے دی جائے وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ (۲/۲۴) اور تم دین اللہ کے معاملہ میں قطعاً نرمی نہ برتو۔ یہاں ضابطہ تعزیرات کیلئے دین اللہ کی اصطلاح آئی ہے۔ یہی دین اللہ ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ۔ یاد رکھو! حکومت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ (۱۲/۴۰) یہی نظامِ مملکت سب سے محکم ہے۔ اس نظامِ خداوندی (دین اللہ) کے تمکّن اور استحکام کیلئے اپنی مملکت کا وجود لاینفک ہے۔ سورۃ النور میں ہے وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ۔ تم میں سے جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق صلاحیت بخش کام کریں۔ خدا نے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ انہیں اسی طرح ملک میں حکومت عطا کرے گا جس طرح اسی قسم کی قوموں کو ان سے پہلے حکومت عطا ہوتی رہی ہے۔ اس حکومت کا مقصد کیا ہوگا۔ فرمایا: وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ (۲۴/۵۶)۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ اس سے اس دین کو تمکّن حاصل ہو جائے جسے خدا نے ان کیلئے پسند کیا ہے۔

اس سے واضح ہے کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر الاسلام پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔

(ماخوذ از طلوعِ اسلام جنوری ۱۹۷۳ء)